وطباعت نفیس، صفحات ۲۸۶، مجلد، قیمت درج نہیں، پتہ: جموں اینڈ کشمیر
اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر۔

ہندوستان کے متاخر شعرائے فارسی میں غنی کشمیری کو غیر معمولی شہرت اور قبول عام حاصل ہے، ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی مشہور ہو چکا تھا، ان کے دیوان کے بکثرت اڈیشن شائع ہوئے، چند سال پہلے جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی نے محمد امین داراب اور علی جواد زیدی صاحبان کا مرتبہ دیوان بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس میں زیدی صاحب کا ایک پُر از معلومات مقدمہ بھی ہے، اب اکیڈمی نے غنی کے حالات وکمالات کا یہ مرقع فارسی زبان میں شائع کیا ہے، جو پانچ فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی میں کشمیر کے جغرافیہ اور طبعی و قدرتی حالات تحریر کیے گئے ہیں، دوسری فصل میں وہاں فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کا حال ہے، تیسری فصل میں غنی کے زمانہ کے ہندوستان خصوصاً کشمیر کے اجتماعی و سیاسی، علمی و ادبی اور مذہبی و اخلاقی حالات بیان کیے گئے ہیں، ایک فصل میں غنی کے سوانح، سیرت و اخلاق، افکار و عقائد اور ان کے معاصرین امراء و اصحاب کمال اور تلامذہ کا ذکر ہے، اس میں ان کے متعلق بعض غلط روایات و واقعات کی تردید بھی کی گئی ہے، آخر میں غنی کی شاعری پر تبصرہ اور اس کے ادبی و فنی محاسن اجاگر کیے گئے ہیں، کتاب کے شروع میں ان کی رہایش گاہ اور مزار کا عکس بھی دیا گیا ہے، ابھی تک غنی کے متعلق اس سے زیادہ مبسوط اور جامع تحریر موجود نہیں تھی، فاضل مصنف اور اکیڈمی دونوں اس ادبی و تحقیقی کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۲ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۳ء عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگ اور اس کے نتائج نے تینوں ملکوں کا امن و سکون ختم کر دیا تھا۔ اُن کے ہزاروں خاندان مصیبت میں مبتلا تھے۔ اور اُن کی کشمکش سے آئندہ بھی بڑے خطرات تھے۔ اس لئے ساری دنیا کی نگاہیں اُن کے مذاکرات پر لگی ہوئی تھیں، خدا کا شکر ہے کہ اس کا ایک مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا، اور تینوں ملکوں کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا۔ اور پوری امن پسند دنیا نے اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا، مگر ابھی متعدد اہم اور نازک مسائل کا حل باقی ہے؛

———— . ————

اس حقیقت کو تینوں ملک سمجھتے ہیں کہ اُن کی فلاح باہمی مصالحت اور تعلقات کی خوشگواری پر موقوف ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش اگرچہ سیاسی حیثیت سے تین ملک بن گئے ہیں لیکن وہ ایک ہی ملک کے کٹے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ اس لئے ان میں جغرافی وحدت، نسلی، تہذیبی اور تجارتی و اقتصادی اشتراک وغیرہ کے اتنے گوناگوں رشتے ہیں، جو سیاسی تقسیم سے نہیں ٹوٹ سکتے اور اُن میں کوئی بھی ملک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، اور وہ آپس میں مل ہی کر ترقی کر سکتے ہیں۔

———— . ————

بنگلہ دیش ابھی نوزائیدہ ملک ہے، اس کی حالت ہر حیثیت سے نہایت ابتر ہے، اس کے

سامنے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل ہیں۔ اُن کو حل کرنے کے لئے اس کو سب سے زیادہ امن و سکون کی ضرورت ہے، پاکستان کو گذشتہ جنگ نے بہت کمزور کر دیا ہے، ہولناک سیلاب کی تباہی اس پر مستزاد ہے، اس کو بھی سنبھلنے کے لئے امن و سکون درکار ہے، ہندوستان اگرچہ طاقتور اور بڑا ملک ہے، لیکن وہ بھی جنگ کے نتائج سے محفوظ نہیں، اور اس کے سامنے اندرونی اور بیرونی مسائل ہیں جو امن کے بغیر حل نہیں ہو سکتے، اس لئے تینوں ملکوں کے لئے امن و صلح کے سوا فلاح کی کوئی راہ نہیں ہے۔

———— . ————

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ جنگی قیدیوں کا تھا، وہ طے ہو گیا ہے، باقی مسائل کا تعلق پاکستان اور بنگلہ دیش سے ہے، اُن کو طے کرنے کے لئے جذبات کے بجائے تدبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے، مفاہمت میں ماضی کے واقعات کو بھلا کر مستقبل کی مصلحتوں کو دیکھنا اور ہر فریق کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ ایسے مسائل پر اڑنے سے جن سے جذبات کی تسکین کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو، کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے دونوں ملکوں کو حقیقت پسندی سے کام لینے کی ضرورت ہے، اگر آئندہ گفتگو میں دونوں ان باتوں کا لحاظ رکھیں تو اُن کے معاملات آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔

———— . ————

اس وقت بنگلہ دیش میں ہزاروں مہاجر اور پاکستان میں بنگالی خاندان مصیبت میں مبتلا ہیں، خود ہندوستان کے لاکھوں مسلمان اپنے پاکستانی اعزہ کے حالات نہ معلوم ہونے سے مضطرب ہیں، اس لئے دونوں ملکوں کی مصالحت کا مسئلہ تنہا سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی اور انسانی بھی ہے۔ اور اس پہلو سے بھی اس کو جلد حل کرنے کی ضرورت ہے ہندوستان

بنگلہ دیش کا بہت بڑا محسن ہے، اُس کی حیثیت اس کے مُربّی کی ہے، اگر وہ اپنے اثر سے کام لیکر دونوں کے معاملات طے کرا دے تو یہ اس کا بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگ نے دونوں کے دلوں میں بڑے گہرے زخم لگائے ہیں لیکن وہ رفتہ رفتہ مندمل ہو جائیں گے، چنانچہ اب سے سال ڈیڑھ سال پہلے دونوں کے جو جذبات تھے وہ اب نہیں ہیں، اور جو اب ہیں وہ آیندہ نہیں رہیں گے، اور ان دونوں کے درمیان اتنے رشتے ہیں اور ان کے مفاد ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہ سکتے، ایک نہ ایک دن ان کو تعلقات قائم کرنا پڑینگے، اس میں تاخیر سے دونوں کا نقصان ہے، اسلئے جسقدر جلد یہ کارِ خیر انجام پا سکے، بہتر ہے، اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ تینوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت اور یا کم سے کم خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو جائے اس کے لئے سارے مراحل کی تکمیل ضروری نہیں ہے، تینوں حکومتیں اس سے پہلے بھی اس کام کو کر سکتی ہیں، آیندہ تعلقات پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا،

افسوس ہے کہ گذشتہ جولائی میں ایک ممتاز علمی شخصیت مولانا ضیاء احمد بدایونی سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے وفات پائی، مرحوم فارسی زبان کے فاضل اور مسلم الثبوت استاد تھے، انھوں نے فارسی کی درسیات پرانے طرز پر پڑھی تھیں اور عربی سے بھی واقف تھے اسلئے فارسی زبان و ادب پر ان کی نظر ماہرانہ تھی، ان کا ذوق بڑا متنوع تھا، مذہبیات اور تاریخ اسلام سے بھی اُن کو دلچسپی تھی، اور ان سب پر اُن کے مضامین اور تصانیف موجود ہیں، ان میں سب سے اہم دیوان مومن کی شرح اور اس کا فاضلانہ مقدمہ ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس طرح سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے کلام غالب کی اہمیت نمایاں کی تھی، اسی طرح مولانا ضیاء احمد نے مومن کے کلام کی اہمیت واضح کی، وہ عملاً نہ صرف دیندار بلکہ خوش عقیدہ مسلمان تھے جس کا اثر اُن کی تمام مذہبی تحریروں میں ہے، اس زمانہ میں جب کہ فارسی کا ذوق گھٹتا جا رہا ہے، مرحوم کی جگہ مشکل سے پُر ہو سکے گی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۷)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا محمد علی کے جیل جانے کے بعد ملک میں ترکِ موالات اور سول نافرمانی کی تحریک بڑے زور سے چل پڑی، جیل جانے والوں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا، ایسی مثالیں بھی سننے میں آئیں کہ سرکاری دفتر کا کوئی ملازم شام کو اپنے کام سے واپس آرہا ہے، راستے میں وہ بھی اس رو میں بہہ گیا اور گھر کے بجائے جیل پہنچ گیا، دسمبر ۱۹۲۱ء و جنوری ۱۹۲۲ء میں ترکِ موالات کے سلسلہ میں تیس ہزار اشخاص جیل گئے، لیکن خود مہاتما گاندھی ابھی باہر تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی حکومت کا خاتمہ اب جلد ہی ہو جائیگا، ہر جگہ کے قید خانے ہندو مسلمانوں سے بھر گئے، دونوں کے اتحاد و یگانگت کے پُر کیف مناظر بھی ہر جگہ دیکھنے میں آرہے تھے، مسلمانوں کے جوش و خروش کا پلہ بھاری تھا، صوبہ سرحد میں اس زمانے میں حکومت نے گولیاں چلائیں تو مسلمانوں کو فخر رہا کہ یہ گولیاں کسی سرحدی مسلمان کی پیٹھ پر نہیں بلکہ سینے پر لگیں، ہندوستانی مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ جیل گئے، ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی کتاب "باپو کے قدموں میں" اس زمانہ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

"اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ عدم تعاون میں شریک تھے، دونوں ہی سب ہی کاموں میں ایک طرح کے مقابلے کی رقابت ہو جاتی، سب جگہوں میں کانگریس کے علاوہ خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئیں اور جوش کے ساتھ ہندوؤں نے خلافت کمیٹیوں کو منظم کرنے اور چندہ جمع کرنے میں مدد کی، مسلمان کانگریس میں ہوتے اور مدد کرتے ہی تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایکا اور اتحاد کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے،"

بہت سے لوگ ایسا ہی خیال کرتے تھے، بقرعید کا دن ایک ایسا دن ہوتا ہے جب خاص کر ہندوستان میں گائے کی قربانی کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑے ہو جایا کرتے ہیں، اس سال جب بقرعید کا دن قریب آیا تو سب کو یہ فکر ہوئی کہ اس اتحاد میں کوئی رکاوٹ نہ پڑنے پائے، گاندھی جی مولانا محمد علی کے ساتھ پھر دورہ کرنے آئے، کئی دن مختلف اضلاع میں پھرتے رہے، سب ہی مقامات پر ان کی اور مولانا کی تقریریں ہوئیں، انھوں نے گائے کی رکھشا اور حفاظت مسلمانوں پر چھوڑ دی، مسلمانوں کی طرف سے اعلان نکالے گئے کہ جہاں تک ہو گائے کی قربانی نہ ہونی چاہیے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال بقرعید میں گائے کی قربانی اتنی کم ہوئی کہ اس سے پہلے شاید کبھی نہیں ہوئی تھی، اس سے اتحاد اور ایکے پر اور بھی مضبوطی کی مہر لگ گئی لیکن بعد میں ایسا معلوم ہوا کہ یہ اتحاد مستقل نہیں تھا۔" (ص ۴۳ - ۲۴۲)

اسی زمانہ میں ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو گورکھپور ضلع میں عوام نے پولیس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر چورا چوری کے تھانے کو چند سپاہیوں کے ساتھ نذر آتش کر دیا، گاندھی جی کو اس سے بڑا دکھ پہنچا، وہ اہنسا اور عدم تشدد کے قائل تھے، ان کے دل کے اندر انسانی محبت کی نہر بہتی رہتی تھی، سپاہیوں کے جلائے جانے سے ایسے غمزدہ ہوئے کہ انھیں یقین ہو گیا کہ تحریک اگر جاری رہی تو تشدد سے محفوظ نہیں رہ سکے گی، انھوں نے بردولی جا کر پوری تحریک روک دی، جس سے ہندو مسلمان دونوں کو بڑی حیرت ہوئی، پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

"فروری ۱۹۲۲ء کے آغاز میں یکایک تمام منظر بدل گیا، جیل خانے میں یہ سنکر بڑی حیرت اور پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کارروائیاں ایکدم

سے روک دیں اور عدم تعاون کی تحریک ملتوی کر دی، اخباروں میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ چورا چوری کے واقعات کی وجہ سے انھوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا، یہ موضع گورکھپور کے ضلع میں ہے، یہاں دیہاتیوں کے ایک مجمع نے پولیس کے مظالم سے تنگ آکر تھانے کو آگ لگا دی، اور چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلا دیا، ہمیں جنگ کے التوا کی خبر سنکر بڑا غصہ آیا، کیونکہ اس وقت ہماری قوت بڑھی ہوئی تھی، اور ہم ہر محاذ پر پیش قدمی کر رہے تھے، لیکن جیل خانے کے اندر ہماری مایوسی اور غصہ سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا، چنانچہ عدم تعاون ختم ہو گیا اور ترک موالات کی کلی کھلنے سے پہلے مرجھا گئی، مہینوں کی تگ و دو اور پریشانی کے بعد حکومت نے بھی اطمینان کا سانس لیا، اور اب اسے پہلے پہل موقع ملا کہ پیش قدمی کرے، چنانچہ چند مہینے کے اندر اندر اس نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے طویل مدت کے لیے جیل خانے میں بند کر دیا۔ (میری کہانی ص ۱۴۲)

پنڈت جواہر لال نہرو یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اس زبردست تحریک کے یکایک بند کر دینے سے ملک میں وہ افسوسناک صورت حال پیدا ہو گئی کہ جس نے قومی تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا، تشدد کے دبے ہوئے جذبات اور طریقوں نے ہاتھ پیر نکالنے شروع کیے، آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات اٹھ کھڑے ہوئے، جو رجعت پسند اور فرقہ پرست ترک موالات کی ہماہمی اور غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے منہ چھپائے بیٹھے تھے، اب انھیں موقع مل گیا، اور وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل پڑے۔"

ملک کی فضا ہی بدل گئی، سب سے بڑا حادثہ مالابار میں پیش آیا، یہاں کے موپلے مسلمان حکومت برطانیہ کے انتہائی مخالف ہو کر اس سے برسرپیکار تھے، انگریزوں کی مخالفت

کو جہاد قرار دیا اور شہادت کے شوق میں مرمٹنے کے لیے آگے بڑھے، انگریزوں سے بری طرح پیش آئے، اور جن ہندوؤں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اُن سے بدظن ہو کر ان کے ساتھ بھی بدسلوکی کی، انگریزوں نے ان کے فسادات پر قابو پا لیا، تو اُن پر ایسے مظالم ڈھائے کہ ان کی تفصیل معلوم کر کے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دو ہزار دو سو چھیاسٹھ موپلوں کو بڑی بے رحمی سے بندوق کی گولیوں سے ہلاک کیا گیا، ۵۶۸۸ گرفتار کیے گئے، ان کو جلا وطن کرنے کی خاطر مال گاڑی کے ایک ڈبے میں ستر موپلے جانوروں کی طرح بھر دیے گئے، جن میں ۶۶ گھٹ گھٹ کر اسی میں مر گئے، ان کے گھروں کو تاراج کیا گیا، ان کو ان کی املاک سے محروم کر دیا گیا، بدقسمتی سے ان کے ساتھ انگریزوں کی یہ سفاکی اور بے رحمی تو نظر انداز کر دی گئی لیکن انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ جو بدسلوکی کی تھی اس کو بہت اچھالا گیا، اس سلسلے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب "باپو کے قدموں میں" جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

"موپلہ لوگ سیدھے لیکن جوشیلے ہوتے ہیں، ان کی بغاوت خلافت کی وجہ سے برٹش سرکار کے خلاف تھی، اس میں مذہبی جذبہ ہی اہم سبب تھا، مذہبی جذبہ جب ایک بار ابھر جاتا ہے تو اس کی بہت سی شکلیں ہو جاتی ہیں، اس بار مالابار میں مذہبی جذبہ نے ایک عجیب رنگ دکھایا، موپلوں کا جھگڑا برٹش سرکار سے تھا لیکن کچھ ایسے ہندوؤں کے ساتھ جن کے متعلق ان کو شبہہ تھا کہ یہ برٹش گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں، انھوں نے سختی اور زیادتی کی، اس کا اثر دوسرے ہندوؤں پر پڑا ....

...... ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ

میں مدد دے کر گاندھی جی اور ان کی لیڈری میں کام کرنے والے دوسرے ہندو رہنماؤں نے زبردست غلطی کی، ان لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہوئی، اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح سے ہندوؤں کے ساتھ وہ لوگ زیادتی کرنے لگے، جو لوگ زیادہ سمجھداری سے باتیں کرنے کا دعوی کرتے تھے، وہ بھی یہ کہنے لگے کہ اسلام کٹرپن سکھاتا ہے، اور چونکہ ساری خلافت تحریک مذہبی تحریک تھی اس لیے اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا، وہ یہ کہ مسلمانوں میں کٹرپن بڑھے، اس کا ہی نتیجہ مالابار میں ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور صرف ہندو ہونے کی وجہ سے ان کے گھر بار لوٹے جانے کی شکل میں دیکھنے میں آیا، دوسری طرف مسلمانوں کا کہنا تھا کہ مالابار کی باتیں بہت بڑھا چڑھا کر ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف جذبہ ابھارنے کے لیے کہی گئی ہیں، اگر کہیں مسلمانوں نے کسی ہندو کے ساتھ زیادتی کی تو اس لیے نہیں کہ وہ ہندو تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نے موپلوں کے خلاف برٹش گورنمنٹ کی مدد کی، علی برادران کا کہنا تھا کہ کانگریس اور ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس بیداری کا سبب یہ تھا کہ ان کے مذہبی عقیدوں پر برٹش گورنمنٹ نے اپنے اعتبار سے گہری چوٹ دی تھی، اگر کانگریس یا گاندھی جی ان کا ساتھ نہ دیتے تو بھی وہ اس مسئلہ کو لیکر برٹش گورنمنٹ سے ضرور لڑتے، چاہے اس لڑائی کا طریقہ کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہوتا، اور اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا، کانگریس اور ہندوؤں نے جو مدد کی تھی، اس کے وہ شکر گذار تھے، لیکن ہندوؤں اور کانگریس کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمانوں کے آجانے سے ان کی بھی طاقت کتنی بڑھ گئی، اور اب وہ اس قابل ہوئے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔"

(ص ۷-۳۰۵-۲۴۴)

ہمارے ملک کی بدقسمتی سے خود ہمارے ہم وطنوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہونے لگے جو یہاں تک بڑھے کہ ملکانہ راجپوتوں کو شدھ بنانے کی کوشش جاری ہوگئی، اور ہزاروں کی تعداد میں شدھ کرلیے گئے، اس کے سربراہ سوامی شردھانند جی تھے جنکو کچھ دنوں پہلے دہلی کے مسلمانوں نے جذبۂ اتحاد میں اتنی عزت دی تھی کہ دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر بٹھا کر ان سے تقریر کرائی تھی، وہ آریہ سماجیوں کے لیڈر تھے، آریہ سماجیوں کے متعلق مولانا محمد علی لکھتے ہیں:-

"جو طریقہ تبلیغ آریہ سماجیوں نے اختیار کیا ہے، اور بزرگان دین کی جس طرح وہ لوگ توہین کرتے ہیں اور مسلمان حکمرانان ہند سے جو پرخاش انھیں ہے اور جس طرح جذبۂ انتقام سے وہ لبریز ہیں، اس سے مجھے سخت نفرت اور بیزاری ہے"

سوامی شردھانند کے متعلق وہ رقمطراز ہیں:-

سوامی شردھانند کو مالوی جی سے زیادہ بہادر اور زیادہ آزاد سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں، اور گو وہ بت پرست نہیں اور جات پات کے قیود سے آزاد ہیں اور ایک تبلیغی مذہب رکھتے ہیں، .... وہ لاکھ اس حکومت سے بیزار ہوں اور اس کے دشمن ہوں، اور اس معاملے میں لاکھ مالوی جی سے علحدہ ہوں .... لیکن میں ہرگز ایسے شخص کو ملک کا دوست نہیں سمجھتا جو مسلمانوں کے خلاف ذلیل حرکات کرنے والوں کو پناہ دے، یا دلائے یا پناہ دینے یا دینے والے کو دوست رکھے" (ہمدرد یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

شدھی تحریک زور پکڑنے لگی تو مسلمانوں نے دفاعی طور پر تبلیغی مہم شروع کی ہندو سنگھٹن کے مقابلہ میں تبلیغ اور تنظیم کے نعرے بلند ہونے لگے، اس کے سربراہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ہوگئے، جو خود بڑے کانگریسی تھے اور آخر وقت تک رہے۔

کانگریس کے اندر بھی پھوٹ پڑ گئی، بعض ممتاز کانگریسی رہنما عدم تعاون اور ترک موالات ختم کرکے صوبوں کی کونسلوں اور مرکزی حکومت کی اسمبلی میں داخل ہوکر حکومت سے ٹکر لینا چاہتے تھے، ان ہی میں پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس اور لالہ لاجپت رائے تھے، انھوں نے سوراج پارٹی قائم کرکے گیا کانگریس کے اجلاس میں اپنی بات منوالی، اس کے بعد کانگریس میں دو جماعتیں ہوگئیں، کونسل میں جاکر کام کرنے والے پرو چینجرز کہلاتے، کونسل کے باہر رہنے والے نو چینجرز کہے جانے، سوراج پارٹی اور گاندھی جی میں ہم آہنگی نہ ہوسکی، لیکن موتی لال نہرو اپنی شخصیت اور ایثار کی وجہ سے گاندھی جی پر بھاری پڑے گاندھی جی ان سے ہار مان گئے، ان سے ٹکر لینے کے بجائے سیاست سے علحدگی اختیار کرلینا زیادہ پسند کیا،

گیا کی کانگریس کے اجلاس کے موقع ہی پر ہندو مہاسبھا کی تاسیس ہوئی، اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ۱۹۲۲ء میں ملتان میں ہندو مسلمان بلوہ ہوگیا، وہاں ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ پنڈت مدن موہن مالوی بھی گئے، اس کے بعد کی داستان ڈاکٹر راجندر پرشاد اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"مالوی جی نے وہاں بھی ایک بات کہہ دی تھی، وہ یہ کہ ہندوؤں کے متحد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ اس قسم کی زیادتی ہوتی ہے، اس لیے ان کو اب متحد ہوجانا چاہیے، اس بات کو انھوں نے بڑی خوبی سے کہا، جس سے ہندو مسلم دشمنی بڑھنے کا خطرہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہندوؤں کا اتحاد مسلمانوں سے لڑنے کے لیے یا ان کی مخالفت کے لیے کیا جائیگا، مسلمانوں میں فضا کچھ سدھر گئی لیکن یہ بات چھپی نہ رہی، دوسری جگہ کے ہندوؤں کو متحد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی،

تھوڑے دنوں میں گیا میں کانگریس ہونے والی تھی، کچھ ہندوؤں نے ہندو سبھا کرنے کا خیال کیا، محترم مالوی جی کو صدر بنانے کا ارادہ کیا گیا، مالوی جی نے صدر بننا اس شرط پر منظور کیا کہ میں بھی سبھا میں شریک ہوں، اور ان کو دعوت دوں، میں نے اس بات کو منظور کر لیا، کیونکہ مجھ کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آئی، بعد میں جب ہندو سبھا کا کانگریس سے اختلاف ہوا تو مالوی جی نے اس بات کو مجھ سے یاد دلایا کہ میرے ہی کہنے پر انھوں نے گیا میں صدر ہونا منظور کیا تھا، بہر حال کچھ ہو، سبھا گیا میں پوری کامیابی سے ختم ہوئی، سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کا وہاں ایک سنگٹھن قائم کرنا طے پایا۔" (باپو کے قدموں میں، ص ۱۳-۳۱۱)

اجتماعی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے سے سیاسی بدگمانی بڑھتی گئی، لیکن مخلص اور محب وطن رہنما اس بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش میں لگے رہے، ان میں سب سے نمایاں نام بنگال کے سی۔ آر۔ داس کا ہے، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبول اور ہر دلعزیز رہے، ان کی وفات کو ایک عرصہ گذرا لیکن آج بھی ان کا نام عزت اور محبت سے لیا جاتا ہے، ہندو مسلمانوں میں اور جھگڑوں کے علاوہ فرقہ وارانہ نمایندگی اور کونسلوں اور ملازمتوں میں تناسب کا جھگڑا بھی تھا، سی۔ آر۔ داس کی کوشش سے بنگال میں ایسا حل تلاش کر لیا گیا جس سے ہندو و مسلمان بظاہر خوش نظر آئے، یہ داس پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا، اس کی رو سے مسلمانوں کو بنگال میں نمایندگی ان کی آبادی کے تناسب سے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ دی گئی، لوکل باڈیز میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی، ان کو ساٹھ فی صدی نمایندگی دی گئی، اور جن ضلعوں میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی، ان کو بھی نمایندگی ساٹھ فی صدی دی، مسلمانوں

کو ملازمت میں پچپن فی صدی دی گئی۔

مولانا محمد علی اس پیکٹ سے خوش تھے، وہ سی۔ آر۔ داس سے بڑی محبت کرتے رہے، ان کی وفات پر ان کو بڑا صدمہ ہوا، ہمدرد میں ان کا ایک نثری مرثیہ دل کھول کر لکھا تو اس کی ابتدا اس طرح کی:۔

آج صبح داس کی موت کی خبر ملی، چند حرف اس سانحہ پر لکھنا چاہتا ہوں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں، قلم اور زبان دونوں قاصر ہیں کہ قلب کی کیفیت کا صحیح صحیح اظہار کر سکیں، دل پر ایک ایسا دھچکا لگا ہے کہ دماغ بالکل مفلوج ہو گیا ہے، الفاظ کی تلاش میں ناکامی کیوں نہ ہو، جبکہ ابھی تک کیفیت قلب ہی کا دماغ کو صحیح طور پر پتہ نہیں چلا، حسیات وجذبات کا ایک تلاطم ہے، جس میں سوائے موجوں کے شور کے کچھ سنائی نہیں دیتا، ان موجوں کے شور کو کس عبارت میں سپرد قلم کروں اور اس تلاطم کا کن الفاظ میں نقشہ کھینچوں۔

پھر داس پیکٹ کا ذکر ان جذبات کے ساتھ کیا،

"بنگال میں مسلمان اور ہندو تقریباً مساوی التعداد ہیں، لیکن مسلمان اپنے افلاس اور جہالت کی بدولت ایک ایسی قوم تھے، جن کا سیاسی پاس و لحاظ کرنا کسی ہندو لیڈر کے خیال میں بھی نہ آتا تھا، تقسیم بنگال کی شورش اور اس کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور بالخصوص تحریکات خلافت و سوراج نے ضرور مسلمانان بنگالہ کو بیدار کیا، لیکن اس پر بھی مجھے سارے ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص مہاتما گاندھی کے سوا نظر نہیں آتا، جو بنگال کے مسلمانوں کا اتنا خیال رکھ سکتا تھا، جتنا کہ داس نے رکھا، لیکن داس کی داد رسی کا اپنی ہی زندگی میں پورا صلہ مل گیا، حکومت نے

لاکھ جتن کیے اور مسلمانوں کو وزارت کی چاٹ دے کر قومی اور ملکی پالیسی سے توڑنا چاہا لیکن بنگال کے مسلمانوں نے داس کا ساتھ دیا، اور حکومت کو بھی پیہم شکستیں نصیب ہوئیں، اور بالآخر کل ہی کی بات ہے کہ حکومت نے اپنی شکست اور داس کی فتح تسلیم کی۔" (ہمدرد ۱۸ر جون ۱۹۲۵ء)

بنگال کی مفاہمت کی طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی اسی رواداری اور خیرسگالی کے جذبے کے اظہار کی ضرورت تھی، مخلص رہنماؤں کو اس کا احساس برابر رہا، ۱۹۲۲ء میں لالہ لاجپت رائے کانگریس کے صدر منتخب ہوئے، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مسلم لیگ کے صدر منتخب کیے گئے، تو ان دونوں نے مل کر ہندو مسلمان کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی، انھوں نے سولن میں سمجھوتے کا ایک خاکہ تیار کیا جو "سولن پیکٹ" کے نام سے مشہور ہوا لیکن آگے چل کر یہ بھی غیر موثر ثابت ہوگیا،

ان ہی حالات میں مولانا محمد علی رہا ہوئے، تو ۱۹۲۳ء کے کوکوناڈا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے لیے وہ بالاتفاق صدر منتخب ہوئے، یہ زمانہ انکی مقبولیت کے شباب کا تھا، جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے، ان کی زیارت کرنے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا، اسی زمانہ میں لکھنؤ آئے، تو امین الدولہ پارک میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا، اس کے صدر چودھری خلیق الزمان تھے، جلسہ گاہ میں ایک ہندو نے ایک ہینڈ بل تقسیم کرنا شروع کر دیا، جس میں لکھا تھا کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر و فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں، ایسا شخص بھلا کانگریس کا صدر کیسے ہو سکتا ہے،

اور جب مولانا محمد علی تقریر کر رہے تھے تو کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کرکے یہی سوال بھی کر دیا، مجمع کچھ پریشان ہوا، لیکن مولانا محمد علی نے بڑی دلیری اور جرأت سے اس کا یہ جواب دیا،

"میں نے علی گڑھ میں جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں، اور ہر جگہ، گاندھی جی اس وقت آزادی ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں، انکے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے، اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا لحاظ ہے وہ مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بھی بڑھکر قابل احترام سمجھتا ہوں، لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے، میں عقیدۃً مسلمان ہوں، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۃً اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ تر سمجھتا ہوں جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں تمام ہندوؤں تمام عیسائیوں تمام غیر مسلموں کے مجموعہ سے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، ہر بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں، اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے، اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہوں، تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی، میری بات کوئی انوکھی بات نہیں، جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل تسلیم کرتا ہے، کیا پنڈت مدن موہن مالوی اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے۔" (محمد علی کی ڈائری، جلد اول ص ۱۳۴ - ۱۳۵)

مولانا محمد علی نے یہ تقریر پورے جوش و خروش کے ساتھ کی، تو مجمع میں بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی، مخالفین سناٹے میں آگئے، اور حامیوں کے چہرے چمک اٹھے،

مجمع تالیوں سے گونج رہا تھا، مسرت کے نعرے بلند ہو رہے تھے، اور مولانا محمد علی
یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر یہ تماشا نہ ہوا"

اس تقریر کے سننے والوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مولانا محمد علی نے یہ بھی فرمایا کہ میرا عقیدہ ہے
کہ دنیا کے تمام لوگوں کی فلاح و نجات اس میں ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہوں،
اور انسانیت کی تکمیل اس میں ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، مجھکو گاندھی جی
سے بڑی محبت ہے اور اس مخلصانہ محبت کی بدولت میری خواہش ہے کہ وہ مکمل انسان
بن جائیں، اور میری سراسر بدخواہی ہو گی اگر میرے دل میں یہ بات پیدا نہ ہو کہ وہ
مکمل انسان بنجائیں، اور ان کو دنیاوی فلاح اور اخروی نجات حاصل ہو،

کوکوناڈا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس شروع ہوا تو مولانا محمد علی نے اپنے
خطبۂ صدارت میں گاندھی جی کو جابجا اپنا سردار اور سردار اعظم کہا، اور اپنے زمانہ
کا سب سے بڑا مسیح نما شخص اور شاہ امن کہا، اور یہ بھی لکھا کہ جو نسخہ انھوں نے ہندوستان
کے امراض کے لیے انتخاب کیا، وہ وہی تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے یہودیہ کے لیے منتخب کیا،
اس سے ظاہر ہوگا کہ ان کے دل میں گاندھی جی کی کتنی محبت اور وقعت تھی، کانگریس
کے اس خطبۂ صدارت میں پہلی اور شاید آخری بار قرآنی آیات اور رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کی تعلیمات کا غلغلہ سنائی دیا، انھوں نے گاندھی جی کے عدم تشدد کو قبول
تو کر لیا تھا، لیکن اسی خطبہ میں یہ بھی اعلان کیا کہ قیامت کے روز عرش الٰہی کے نیچے میں تشدد
کے مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہونا پسند کروں گا لیکن نامردانہ اطاعت کے ناگفتہ بہ جرم کا

مرتکب ہونا پسند نہ کروں گا، ہندو مسلمان تعلقات پر طویل بحث کرنے کے بعد انھوں نے کہا

"یہ بات مسلّم اور یقینی ہے کہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور نہ
مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے، اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں تو
ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس موقع کو اس وقت کھو دیا جب کہ محمد بن قاسم
نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا، اس وقت تو مسلمان قلیل تعداد
میں تھے، اور اب تو ان کی تعداد سات کرور سے بھی زیادہ ہے، اور اگر مسلمانوں
کو اس قسم کا کوئی خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا موقع ہاتھ سے کھو دیا، جب کہ وہ
کشمیر سے راس کماری اور کراچی سے چٹاگانگ تک حکمراں تھے، اس وقت اگر وہ چاہتے
تو ہندوؤں کی نسل کو فنا کر سکتے تھے، فارسی کی کیا خوب مثل ہے، ع مشتے کہ بعد از جنگ
یاد آید بر کلہ خویش بزن۔ جب کوئی چارۂ کار نہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے
چھٹکارا پا سکیں تو ان کی ایسی صورت نکالنی چاہیے کہ ایک دوسرے کی معاونت
تسلیم کی جائے"

اس کے بعد کی روداد پنڈت جواہر لال نہرو کی زبانی سنیے:۔

"دسمبر ۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکوناڈا (دکن) میں ہوا، مولانا
محمد علی صدر تھے، حسب عادت انھوں نے ایک بے حد طویل خطبۂ صدارت پڑھا،
لیکن تھا وہ دلچسپ، انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کی
نشو و نما کا خاکہ کھینچا ...... محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی
صدارت کے دوران آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کا عہدہ قبول کر لوں، ایسی
حالت میں کہ ملک کے آیندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں

نہ تھی، کوئی انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن میں محمد علی سے انکار نہیں کر سکا، اس کے علاوہ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کوئی دوسرا شخص سکریٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ اس ہم آہنگی سے کام نہ کر سکے جس طرح سے میں کر سکتا تھا۔ ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی دونوں بہت شدید ہوا کرتی تھی، اور میں خوش قسمتی سے ان لوگوں میں تھا جنھیں وہ پسند کرتے تھے، ہم میں الفت اور محبت کے تعلقات تھے۔ اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے، ان پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جس میں میرے خیال میں عقلیت کی جھلک تک نہ تھی، میں اس معاملہ میں ان کے بالکل برعکس تھا، مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا۔ ان کی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی، لیکن بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا، اسی کی وجہ سے کتنے دوست ان سے چھوٹ گئے، یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن میں آجائے اور وہ اسے بے کہے چھوڑ دیں، اس وقت انھیں اس کا ذرا خیال نہ آتا کہ نتیجہ کیا ہوگا...... ان کی صدارت کے زمانے میں ہم دونوں میں اچھی طرح نبھی، اگرچہ معمولی اختلافات اکثر ہو جاتے تھے......

ان میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی، محمد علی کی یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قرارداد میں کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے، مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں، میں اس کے خلاف احتجاج کرتا تو وہ مجھ پر برس پڑتے، اور میری بے دینی پر مجھے خوب ڈانٹتے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعد میں وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ چاہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کہو، لیکن دل سے تم مذہبی آدمی ہو، میں نے اکثر اس پر غور کیا کہ ان کے اس

بیان میں کہاں تک صداقت ہے ......

"مجھ سے اور محمد علی سے مذہبی بحثیں نہیں ہوتی تھیں، لیکن ان میں خموشی کا وصف نہیں تھا، آخر چند سال بعد (غالباً ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء میں) ان کو یارائے ضبط نہ رہا، اور ایک دن جب میں ان کے گھر میں ان سے ملنے گیا تو برس ہی پڑے، کہنے لگے کہ تم سے مذہب کے معاملہ میں بحث کیے بغیر نہ مانوں گا، میں نے انھیں باز رکھنے کی ہزار کوشش کی، اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑ سکتا، لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے، کہنے لگے کہ یہ بحث تو آج ہو گی ضرور، تم سمجھتے ہو گے کہ مجھے مذہبی جنون ہے، لیکن آج میں یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں، سچا جذبہ ہے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں مذہبی مسائل کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کر چکا ہوں اور مجھے ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب خصوصاً اسلام اور عیسائیت پر کتابیں بھری ہوئی تھیں، ان میں بعض جدید کتابیں بھی تھیں، مثلاً ایچ جی ویلس کی کتاب "خدا نادیدہ بادشاہ" جنگ کے زمانے میں جب وہ کئی سال نظر بند رہے تو انھوں نے قرآن کو بار بار پڑھا، اور سب تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا تھا، اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قرآن میں ۹۷ فی صدی ایسی باتیں ہیں جو سراسر عقل کے مطابق ہیں، اور قرآن سے الگ کر کے اپنی جگہ پر بھی انھیں ثابت کیا جا سکتا ہے، باقی تین فی صدی باتوں کو اگرچہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی، لیکن یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فی صدی باتیں بدیہی طور پر صحیح ہیں تو باقی ۳ فی صدی بھی صحیح ہوں گی، بہ نسبت اس خیال کے کہ ہماری ناقص عقل صحیح ہے

اور قرآن غلط، اس قرآن کے حق میں شہادت اتنی قوی تھی کہ وہ اسے سو فی صدی صحیح تسلیم کرنے لگے۔ اس دلیل کی منطق اگرچہ واضح نہ تھی لیکن میں بحث سے گریز کر رہا تھا، اس کے بعد جو کچھ انھوں نے کہا اس پر واقعی مجھے بہت تعجب ہوا، کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کو بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا، میں جانتا ہوں کہ باپو (گاندھی جی) نے قرآن کو غور سے پڑھا ہے، اور وہ ضرور اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں گے لیکن محض خود بینی کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔" (میری کہانی حصہ اول ص ۲۰۴-۲۰۲)

اسی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت ہی معنی خیز جملے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہونے لگی، یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔ (میری کہانی جلد اول ص ۲۰۴)

محمد علی کی صدارت کا زمانہ ان کے لیے بہت ہی غمناک رہا، ان کی صاحبزادی ان کے قید کے زمانے سے بیمار تھیں، جیل ہی سے یہ دردناک غزل لکھ کر بھیجی تھی۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب — تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

ان اشعار میں ایک بے چین، مضطرب اور مجبور باپ کی کیسی دردناک گڑگڑاہٹ ہے، لیکن باپ کی محبت مومن کی شان تفویض اور شان توکل کے نیچے دبی ہوئی ہے، یہی آمنہ بی بی کوکوناڈا کے اجلاس کے تین مہینے کے بعد جنت کو سدھاریں، اور ابھی مولانا اپنی پیاری بیٹی کا ماتم کر ہی رہے تھے کہ ترکی سے خبر پہنچی کہ وہاں کی نیشنل اسمبلی نے خلافت ختم کر دی، اور ۳، ۴ اپریل ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب میں خلیفہ عبد المجید اپنی دو بیویوں، ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے ساتھ ترکی سے نکل گئے، اس حادثہ سے مولانا محمد علی پر کیا گذری ہوگی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس چیز کے لیے انھوں نے جان ومال کی بازی لگا رکھی تھی، برطانوی حکومت سے ٹکر لیکر جیل کی سختیاں برداشت کی تھیں، مسلمانوں کے مذہبی ضمیر کو بیدار کر کے انکو خون کی ہولی کھیلنے کے لیے آمادہ کیا تھا، وہ ترکی میں ختم ہو کر رہ گئی، وہ دیوانے ہو کر کسی جنگل کی طرف نکل کھڑے ہوتے، تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، خود ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"خلافت کے اس تصفیہ نے دل کی وہ حالت کر دی ہے کہ اگر خداوند کریم کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو نہ معلوم میری کیا کیفیت ہو جائے۔"

(محمد علی کی ڈائری جلد اول ص ۱۵۳)

خلافت کا سقوط مولانا محمد علی ہی کی زندگی کا المیہ نہ تھا، بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک بڑا دردناک حادثہ تھا، مسلمانوں کی تیرہ سو برس کی مذہبی، سیاسی اور بین الاقوامی مرکزیت جاتی رہی، وہ موتی کی لڑی جس میں وہ ایک دوسرے سے منسلک تھے، بکھر کر رہ گئی، وہ عیسائیوں کی سیاسی چالبازیوں سے ضرور مات کھا گئے، لیکن اس میں خود ان کی نااہلی، ناعاقبت اندیشی اور نااتفاقی کو بھی بہت کچھ دخل تھا،

حوادثِ زمانہ کے وہ تھپیڑے بلکہ طمانچے کھاتے رہے، لیکن ان کو ہوش نہیں آیا، وہ اب پیچھے مڑکر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد وہ محض سیاسی کھلونے بن کر رہ گئے ہیں، ان کو ایک لڑی میں پرونے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی،

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اس زمانہ میں ہندو مسلمان فسادات بھی برابر ہو رہے تھے، جن میں سب سے زبردست بلوہ صوبہ سرحد کے شہر کوہاٹ کا تھا، ایک ہندو شاعر نے ایک ایسی نظم شائع کی جو مسلمانوں کے لیے نہایت اشتعال انگیز تھی، اس پر بلوہ شروع ہو گیا جس میں دو دن کے اندر چھتیس[۳۶] آدمی مارے گئے، گاندھی جی اور مولانا شوکت علی دونوں کوہاٹ پہنچے، گاندھی جی کی نظر میں مسلمان قصوروار تھے، لیکن مولانا شوکت علی نے ان سے اتفاق نہیں کیا، اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ دونوں میں اختلاف ہوا، لیکن گاندھی جی نے اس کی تلافی مولانا محمد علی کے دہلی کی قیام گاہ پر ۲۱ روز کا برت رکھ کر کی، گاندھی جی نے یہ فیصلہ مولانا محمد علی کے مشورہ کے بغیر کیا، اس لیے ان کو بڑا تعجب ہوا، مولانا محمد علی کو یہ اقدام خودکشی کے مرادف معلوم ہوا، اس لیے گاندھی جی کے کمرہ کے پاس پہنچکر پہلے تو روئے اور ان سے برت کا ارادہ ترک کرنے کو کہا، لیکن وہ نہ مانے تو پھر غایتِ محبت و اخلاص سے کہنے لگے کہ ہم سے صلاح و مشورہ کے بغیر اتنا اہم قدم آپ نے کیسے اٹھا لیا، دنیا کے سامنے تو یہ مشہور ہے کہ علی برادران کے مشورہ کے بغیر سانس بھی نہیں لیتے، پھر ہم لوگوں سے بالکل راز رکھ کر اتنی سخت کارروائی کر گذرے، یہ ہمارے ساتھ بدعہدی اور دغابازی ہوئی یا نہیں، یہ تو دھوکا دینا ہوا، ہمیں بدنام کرنا ہوا، پھر اگر یہ سخت مجاہدہ آپ نہ جھیل سکے اور آپ کی جان چلی گئی تو ساری ہندو

قوم کا غصہ مسلمانوں ہی پر اترے گا کہ ایک مسلمان میزبان نے اپنے مہمان کو مرجانے دیا، اور اس طرح ہندو مسلم منافرت کی آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑکے گی۔ اس کا جواب گاندھی جی نے یہ دیا کہ اب تو خدا کے سامنے عہد کر چکا ہوں، مولانا نے تڑپ کر جواب دیا کہ جو عہد ہمارے مشورے کے بغیر کیا جائے وہ عہد ہی کب ہے، قسمیں تک جو جلد بازی اور بے سوچے سمجھے کھالی جاتی ہیں، قرآن نے جسے آپ بھی سچا اور خدائی کلام سمجھتے ہیں، ان کو لغو قرار دیا ہے اور ان کی پابندی لازمی نہیں رکھی ہے، یہ کہکر قرآن مجید کی آیت سنائی لایؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم۔ گاندھی جی یہ سب مسکرا کر سنتے رہے، اور انھوں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا، مولانا محمد علی نے پریشان ہوکر اپنی والدہ بی اماں کو بیچ میں ڈالا جو اس وقت بستر مرگ پر تھیں، انھوں نے گاندھی جی کو پیام بھیجا کہ تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو تو میرا حکم مانو اور اپنے اس ارادہ سے باز آجاؤ، میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمہارے پاس کوٹھے پر آتی، گاندھی جی اس کا جواب کہلوایا، اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس باب میں کر سکتا تو آپ کی بات ضرور مان لیتا۔

گاندھی جی نہ مانے اور انھوں نے برت شروع کر دیا، دو تین دن کے بعد وہ مولانا محمد علی کے گھر سے شہر کے باہر ایک کوٹھی میں لے جا کر رکھے گئے، مولانا محمد علی کے ساتھ مولانا شوکت علی ان کی دیکھ بھال میں لگے رہے، مولانا محمد علی نے گاندھی جی کی جان بچانے کے لیے سب ہی جماعتوں اور مذہبوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس طلب کی، ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بیان ہے کہ اس میں کانگریس کے علاوہ ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، پارسی سب ہی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے،

عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری کلکتہ کے لارڈ بشپ بھی کانفرنس میں آئے، کئی دن تک بحث و مباحثہ رہا، آخر میں جھگڑوں کے جو اسباب ہوا کرتے تھے، مثلاً شدھی، گائے کی قربانی، مسجد کے سامنے باجا بجانا وغیرہ وغیرہ، ان سب ہی باتوں پر تجویزیں منظور ہوئیں، گاندھی جی کو اس سے اطمینان ہوا تو انھوں نے اپنا برت ختم کیا

لیکن یہ سمجھوتہ بھی عارضی ثابت ہوا، فسادات کا خاتمہ نہیں ہوا، سنگھٹن، تنظیم، مسجد کے سامنے باجہ اور ذبیحہ گاؤ پر اختلافات بڑھتے گئے، محرم، دسہرہ اور ہولی پر فسادات کا ہو جانا ایک عام بات ہو گئی، نومبر ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی نے ایک آل انڈیا پارٹیز کانفرنس طلب کی جس میں ہندو مسلمان کے جھگڑوں کو طے کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کانفرنس بھی کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکی،

مولانا محمد علی کے بعد دسمبر ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی بلگام میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے، انھوں نے جو صدارتی خطبہ دیا، وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو پسند نہ آیا، وہ لکھتے ہیں :-

"۱۹۲۴ء میں کانگریس کا اجلاس بلگام میں ہوا اور گاندھی جی اس کے صدر ہوئے، ان کے لیے صدر ہونا گویا تنزل تھا، کیونکہ وہ عرصہ سے کانگریس کے مستقل صدر تھے، ان کا خطبۂ صدارت پسند نہیں آیا، مجھے تو یہ محسوس ہوا جیسے اس میں بالکل جان ہی نہ تھی۔ (میری کہانی جلد اول ص ۲۶)

اس کے برخلاف مولانا محمد علی نے اس خطبہ کی مدافعت "میں آزادی کی محبت کو چیلنج" کے نام سے جو انگریزی تحریر لکھی، وہ ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، گاندھی جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترک موالات، عدم تشدد،

چرخہ، ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات، سوراج، آزادی، معاشرتی اصلاحات، اور قومی تعلیم وغیرہ پر جو کچھ کہا تھا، ان کی وضاحت مولانا محمد علی نے بہت ہی مؤثر انداز میں کی، اور ان کی قیادت پر اپنے اعتماد کلی اور یقین کامل کا اظہار کیا۔

انھوں نے گاندھی جی کے سوادھرم اور سوراج کی زبردست مدافعت کی، اور یہ بھی اعلان کیا کہ اگر اس کے سوادھرم اور سوراج میں مذہبی آزادی حاصل ہو تو وہ ایسے ہی سوادھرم اور سوراج کو پسند کریں گے، خواہ اس کے چلانے والے ہندو ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ایسی حکومت میں جہاں مذہبی آزادی نہ ہو وہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گی، خواہ وہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو۔

گاندھی جی کی صدارت میں بھی ہندو مسلمان کے اختلافات ختم نہیں ہوئے تو دہلی میں ایک ملاپ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا محمد علی نے یہ تقریر کی:

"اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے جب بھی میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، میری ماں کو قتل کرے جب بھی میں عدالت میں مقدمہ نہیں لیجاؤنگا، لیکن اس بدترین صورت حال کا علاج ہونا چاہیے، ذرا ذراسی بات پر ہم کو چاہیے کہ تلوار میان سے نہ نکال لیا کریں، ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے، اور اغیار برابر مضحکہ اڑائیں گے، اور ہم پر زبان طعن دراز کریں گے،

لیکن اس قسم کی تقریر کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا، فسادات میں اضافہ ہوتا ہی رہا، ہندو مسلم تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے، ملک کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی، گاندھی جی جیسے انتھک کام کرنے والے رہنما بھی بددل ہو گئے، اور یہ کہکر کہ اب میری

بات کوئی نہیں سنتا ، سیاست سے علیحدہ ہوگئے اور اپنا وقت اصلاحی کاموں میں صرف کرنے
لگے ، ان کی سیاسی کنارہ کشی کے بعد کانگریس کی سیاست پر زیادہ تر سوراج پارٹی چھائی رہی،
جس کی باگ موتی لال نہرو اور سی ، آر ، داس کے ہاتھ میں تھی، مولانا محمد علی، گاندھی جی
کی طرح نوچینجرز میں تھے ، ہندو مسلم اتحاد سے مایوس نہیں ہوئے ، انھوں نے مولانا
شوکت علی کی مدد سے ہندو مسلم جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے شملہ میں ایک یونیٹی کانفرنس
منعقد کرائی جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی لیکن یہ بھی شورش بے مدعا ہو کر کچھ زیادہ
موثر نہ ہو سکی ،

اسی اثنا میں حجاز میں غیر معمولی سیاسی صورت حال پیدا ہوگئی، پہلی جنگ عظیم کے بعد وہاں
حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں شریف حسین کی حکومت قائم ہوگئی تھی، جو آل رسول میں تھے ، وہ انگریزوں
کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے ، اس لیے عالم اسلام میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے ،
اسکے باوجود خلیفۂ اسلام بننے کی فکروں میں لگے ہوئے ہوئے تھے ، اپنے خاص خاص نمائندوں کے ذریعے
مسلمانوں سے بیعت طلب کرتے ، حجاج کو طرح طرح سے تنگ کرتے ، بے گناہ مسلمانوں، حاجیوں
اور حجازیوں کا خون کرنے میں تامل نہ کرتے ، اور پورے جزیرۃ العرب کے بادشاہ بننے کی بھی
کوشش تھی ، اپنے ایک بیٹے امیر فیصل کو انگریزوں کا حلیف بنا کر عراق کا بادشاہ بنوا دیا ، اور دوسرے
بیٹے امیر عبد اللہ کو شرق اردن کا حکمراں تسلیم کرا لیا ،

نجد کے سلطان ابن سعود سے انکی پرانی عداوت تھی ، اس لیے اہل نجد کو حج کرنے سے روک دیا ،
جس سے حکومت نجد سے برابر چھیڑ چھاڑ جاری تھی ، بالآخر دونوں میں باضابطہ جنگ شروع ہوگئی ،
تو ستمبر ۱۹۲۴ء میں نجدی فوجیں طائف میں داخل ہوگئیں ، وہاں شریف حسین کے بیٹے امیر علی حکمراں
تھے ، وہ طائف چھوڑ کر مکہ معظمہ بھاگ گئے لیکن نجدی فوجیں مکہ معظمہ کی طرف بڑھیں تو شریف حسین اور

امیر علی دونوں جدہ میں جاکر پناہ گزیں ہوئے ، وہاں شریف حسین خود تو حکومت سے علٰحدہ ہوگئے
لیکن امیر علی کو دستوری ملک الحجاز بنا دیا ،

مولانا محمد علی کو یہ وحشت ناک خبریں ملیں تو وہ بے چین ہوگئے ، اور انھوں نے خلافت کانفرنس
کی طرف سے وہاں ایک وفد بھیجکر صحیح صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی ، اور اس وفد کے صدر
استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی ہوئے ، اور اسکے ارکان مولانا عبد الماجد بدایونی اور
مولانا عبد القادر قصوری تھے ، یہ وفد ۱۸ دسمبر ۱۹۲۴ء کو حجاز روانہ ہوا ، جو ہندوستان کے مسلمانوں
کی طرف سے یہ پیام لیکر گیا کہ حجاز میں اسلامی شرع کے اصولوں پر جمہوری حکومت قائم ہو جسمیں
حجاز کی اندرونی آزادی کو پورے طور پر قائم رکھتے ہوئے تمام وہ مسائل جو حجاز کی اسلامی مرکزی حیثیت
سے تعلق رکھتے ہوں مسلمانان عالم کے مرضی و مشورہ سے طے ہوں ، اسکے لیے ایک ایسی اسلامی موتمر کا
انعقاد ہو جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے شامل ہوں اور حجاز کی جمہوریت کے ساتھ
شریف حسین اور اس کے خاندان کا کوئی تعلق نہ ہو ، وغیرہ وغیرہ ،

یہ وفد جدہ پہنچا تو اس وقت شریف حسین کے بیٹے امیر علی کی حکومت تھی ، وفد نے امیر علی
اور اسکے وزراء سے ملاقاتیں کیں ، لیکن انھوں نے یہ بتایا کہ حجاز میں جمہوری حکومت ناممکن العمل ہے ،
جس کے بعد موتمر اسلامی کا انعقاد بے سود ہے ، اسوقت سلطان ابن سعود سے جنگ جاری تھی ، اسلیے
وفد کو جدہ سے آگے جاکر ابن سعود سے ملاقات کرنے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ ابن سعود امیر علی
کو حجاز کا حقدار بادشاہ تسلیم کرلیں ، ظاہر ہے کہ یہ شرط پوری نہیں ہوسکتی تھی ، اسلیے وفد بڑی پریشانیوں
کے ساتھ جدہ سے ہندوستان واپس آگیا ،

ابن سعود اور امیر علی کی جنگ جاری تھی کہ ابن سعود نے یہ اعلان کیا کہ میں حجاز پر اپنی بادشاہت
قائم کرنے نہیں جارہا ہوں بلکہ میں تو اس ارض پاک کو شریفیوں کے پنجۂ ظلم وستم سے نجات دلانے کو

اٹھا ہوں، ذریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام، وہ جسے چاہیں اپنا حکمراں منتخب کرلیں گے۔

اس اعلان کے بعد مولانا محمد علی کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی مدتوں کی آرزو پوری ہوتی نظر آرہی ہے۔ یعنی شریف حجاز سے نکال دیے گئے، تو وہاں اب بادشاہت نہ ہوگی، بلکہ تمام اسلامی ممالک مل کر وہاں ایک شرعی جمہوریت قائم کریں گے، جہاں عالم اسلام کی رائے اور شوریٰ سے حکومت ہوگی، مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہوگی، اور مسلمانوں کے روز روز کے جھگڑے ختم ہوجائیں گے، ترکوں نے خلافت ختم کردی تھی، تو اس کا نعم البدل حجاز میں مل جائے گا۔ مولانا محمد علی کے دل کی آرزوئیں پھر سرسبز اور شاداب ہونے لگیں، اور ان کو یقین ہوگیا کہ حجاز میں شریعت مطہرہ قائم ہوکر رہے گی، اس لیے وہ سلطان ابن سعود کے طرفدار ہوگئے، لیکن جب اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سلطان ابن سعود کی نجدی فوج نے مدینہ منورہ پر حملہ کرکے گولہ باری کی تو مسجد نبوی کے ان گنبدوں کو بہت نقصان پہنچا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار ہے، پھر تو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں بہت اشتعال پیدا ہوا، مولانا محمد علی اس حادثہ کو جنگ کا ایک اتفاقی حادثہ سمجھے، لیکن انکے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سلطان ابن سعود کے مخالف ہوگئے، اور انھوں نے خدام الحرمین قائم کرکے سلطان ابن سعود کی مخالفت شروع کردی، انکے ہمخیال اور بہت سے لیڈر اور مسلمان ہوگئے، مولانا محمد علی بڑی آزمائش میں مبتلا ہوگئے، ایک طرف انکے اپنے مخلصانہ جذبات تھے، دوسری طرف انکے مرشد کے خیالات تھے لیکن وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوگئے اور مرشد سے اختلاف مول لے لیا اور جب اپنے مرشد کے شہر لکھنؤ آئے اور ایک جلسہ کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تو انھیں اتنا ہڑبونگ ہوا کہ کچھ بول نہ سکے۔

(باقی)

اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید

از جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب پٹنہ

(۲)

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے لئے اقبال کے مثبت تصورات کیا ہیں؟ اس کی وضاحت کے لئے خطبات اور منظومات سے کچھ مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔

"اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلعم کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے، باعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن باعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے، یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے، اس لئے اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر پوری طرح پر ثابت کردیا جائیگا، استقرائی عقل کا ظہور ہے، اسلام میں چونکہ نبوت اپنے معراج کمال کو پہونچ گئی اس لئے اسکا خاتمہ ضروری ہوگیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی نہیں بسر کرسکتا، اس کے شعور ذات کی تکمیل اسی طرح ہوگی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے، اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا، یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالم فطرت اور عالم تاریخ

کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اسی لئے کہ ان سب میں یہی نکتہ مضمر ہے، اور
یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو
حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے جو بہ اعتبار نوعیت انبیا کے احوال و
واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہے، قرآن مجید نے آفاق
والنفس، دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہیہ
کا ظہور محسوسات و مدرکات میں خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل
کی، ہر جگہ ہو رہا ہے، اس لئے ہم کو چاہیئے کہ اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا
پورا اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصول علم میں کہاں تک مدد
مل سکتی ہے، غرض تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ زندگی
میں اب صرف عقل ہی کی کارفرمائی ہوگی، اور جذبات کے لئے اس میں کوئی
جگہ نہ ہوگی، یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہیئے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ
وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام
لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں، اس لئے کہ جب ہم نے ختم نبوت
کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق
نہیں ہے کہ اس کے علم کا تعلق مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے، اس لئے ہمارے
لئے اس کی اطاعت لازمی ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا
تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعووں کا قلع
قمع ہو جاتا ہے، اور جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات
اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں، بعینہٖ جس طرح

اسلامی کلمہ کے جزوِ اول نے انسان میں یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق
اپنے محسوسات و مدرکات کا مطالعہ نگاہ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت
کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے، جو قدیم تہذیبوں کا دستور تھا
اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ انکی حیثیت کیسی
ہی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسا دوسری
واردات کو اور اس لئے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں"

(اسلامی ثقافت کی روح: تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

"...... بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس سلسلے میں دو بڑے تصور ہمارے
سامنے آتے ہیں، دونوں تعلیمات قرآنی کا سنگ بنیاد ہیں۔

(۱) وحدتِ مبدأ حیات، اور ہم نے تمھیں نفسِ واحد سے پیدا کیا، یہ ہے
قرآن مجید کا ارشاد، مگر پھر یہ امر کہ زندگی کا ادراک بطور ایک وحدتِ
نامیہ کے ہو جائے کچھ دیر ہی کے بعد ہوتا ہے، یوں بھی اس تصور کا نشوونما
اس امر پر موقوف ہے کہ اقوام و امم احوال عالم کی اصل رو میں داخل
ہو جائیں، اسلامی فتوحات کی رفتار چونکہ بڑی تیز تھی اس لئے مسلمانوں
کو یہ موقع جلد ہی میسر آگیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام سے بہت
پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا، لیکن یہ بات کہ نوعِ
انسانی ایک جسم نامی ہے، مسیحی روما کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی، فلنٹ کہتا
ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو بات کسی عیسائی حکومت روما کے کسی مصنف کے
حق میں کہی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ اس کے ذہن میں وحدتِ انسانی کا ایک

مجرد تصور موجود تھا، مگر پھر رومی عہد سے لے کر اب تک صورت حالات کچھ ایسی
ہے کہ یہ تصور یورپ کے دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہو سکا، بلکہ اس کے برعکس
وطنی قومیت کے نشو و نما سے جس کا سارا انحصار نام نہاد قومی خصائص پر ہے،
وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا، برابر دب
رہا ہے، مگر عالم اسلام کی تاریخ اس سے کس قدر مختلف ہے، یہاں وحدت
انسانی کا خیال نہ محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا، اور نہ شاعرانہ خواب، بلکہ
روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو غیر محسوس طریق پر اپنا کام
کرتا رہا۔

(۲) اس امر کا گہرا احساس کہ زمانہ ایک حقیقت ہے، اس لئے زندگی
کا یہ تصور کہ وہ عبارت ہے ایک مسلسل اور مستقل حرکت سے، ابن خلدون
کے نظریہ تاریخ میں ہماری دلچسپی کا خاص مرکز بن جاتا ہے، اور فلنٹ بھی
بجا طور پر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے ..... یہ تصور بڑا اہم
ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ چونکہ زمانہ کے اندر ایک مسلسل حرکت ہے
جس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اس کی نوعیت فی الواقع تخلیقی ہے ....
اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی
طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں، قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ اختلاف
لیل و نہار کو حقیقت مطلقہ کی ایک آیت تصور کرنا چاہئے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان
ہے، اسلامی مابعد الطبیعیات کا یہ رجحان کہ زمانہ ایک خارجی حقیقت ہے
ابن مسکویہ کا یہ نظریہ کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے اور

بیرونی کا یہ صاف و صریح اور واضح اقدام کہ کائنات کا تصور بطور ایک
عمل تکوین کے کرنا چاہئے، یہ سب باتیں ابن خلدون کو ذہناً ورثے میں ملیں
...... یہ اسی کی ذہانت و فطانت تھی کہ قرآن مجید کی روح جو سر تا سر یونانیت
کے منافی ہے حکمت یونان پر ہمیشہ کے لئے غالب آگئی۔"
(ایضاً)

"...... بہ حیثیت ایک اصول عمل کے توحید اساس ہے حریت، مساوات اور
حفظ نوعِ انسانی کی، اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام کے رو سے ریاست
کا مطلب ہوگا، ہماری یہ کوشش کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی
دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں، یہ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو
ایک مخصوص جمعیت بشری میں متشکل دیکھنے کی، لہٰذا اسلامی ریاست کو انہی
معنوں میں حکومتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس
کی زمام اقتدار کسی ایسے خلیفۃ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں جو اپنے
جور و استبداد پر پردہ ساڈالے رکھے ......"

دراصل ترک وطن پرستوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کا اصول
مغربی سیاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا، مسیحیت کی ابتدا کسی وحدتِ
سیاسی یا مدنی کے طور پر نہیں ہوئی تھی، وہ ایک نظام رہبانیت تھا جو
اس ناپاک دنیا میں قائم کیا گیا، اور جس کا امور مدنی میں کوئی دخل نہیں
تھا، جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے، وہ ہر معاملے میں رومی حکومت کے
زیر فرمان رہی، مگر پھر جب آگے چل کر اسکو ریاست کا مذہب قرار دیا
گیا تو ریاست اور کلیسا نے دو حریف قوتوں کی شکل اختیار کر لی اور

ان کے حدود و فرائض کی تعیین و تحدید میں بحث و نزاع کا ایک غیر مختتم سلسلہ
شروع ہو گیا لیکن اسلام میں یہ صورتِ حال پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی اس
لئے کہ اسلام کا ظہور بطور ایک اجتماع مدنی کے ہوا اور قرآن مجید کی بدولت اسے
وہ صاف و سادہ قانونی اصول مل گئے جن میں جیسا کہ تجربے نے آگے چل کر ثابت
بھی کر دیا یہ زبردست امکانات موجود تھے کہ رومیوں کی دوازدہ الواح کی طرح
انھیں بھی بذریعہ تعبیر و تاویل مزید وسعت دی جا سکے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے
تو ترک وطن پرستوں کا نظریۂ ریاست بڑا غلط اور گمراہ کن ہے، کیونکہ اس کی
رو سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام کے اندر بھی کوئی ثنویت کام کر رہی ہے،
حالانکہ اسلام میں اسکا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔"

(الاجتہاد فی الاسلام: تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)

اس کے برعکس حزبِ اصلاحِ مذہبی نے، جس کی زمامِ قیادت سعید حلیم
پاشا کے ہاتھ میں تھی، اس بنیادی حقیقت پر زور دیا کہ اسلام میں عینیت اور
اثباتیت دونوں کا امتزاج بڑی خوبی سے ہو چکا ہے، یوں بھی اس نے حریت،
مساوات اور استحکامِ انسانیت کی ابدی صداقتوں کو ایک وحدت میں
سمو دیا اس لئے اسکا کوئی وطن نہیں، جسطرح ریاضی نہ انگریزی کے ساتھ نہ
کیمیا فرانسیسی کے ساتھ، وزیر اعظم ترکی کے نزدیک نہ تو کسی ترکی اسلام کا
وجود ہے، نہ عربی، ایرانی اور ہندی اسلام کا، مگر جس طرح علمی حقائق کی عالم گیر
نوعیت سے ہر قوم کے اندر علم و حکمت کی پرورش اپنی مخصوص قومی شکل میں ہوتی
رہتی ہے، اور وہ سب مل کر ہمارے علمی سرمائے کی نمائندگی کرتی ہیں، ایسے ہی

اسلامی صداقتوں کی عالمگیر نوعیت سے بھی ہمارے قومی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد
کی دنیا میں گونا گونی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ اس بڑے ہی بابصر اہل قلم کا خیال
ہے کہ تہذیب جدید کو جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے، انسان کے دورِ وحشت
و بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہئیے، وہ نتیجہ ہے ایک حد سے زیادہ
نشو و نما یافتہ صنفیت کا اور اس لئے محض ایک ذریعہ انسان کی ابتدائی جبلتوں
اور رجحانات کی تسکین کا۔ سعید حلیم پاشا کو افسوس ہے کہ اسلام کے اخلاقی
اور اجتماعی مقاصد بھی بعض ایسے توہمات کے زیر اثر جو امم اسلامیہ کے اندر
زمانۂ قبلِ اسلام سے کام کر رہے تھے، غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے،
ان کے مقاصد بھی تو اسلامی بہت کم ہیں، عجمی، عربی یا ترکی زیادہ، نہ توحید
کا صاف ستھرا اور پاکیزہ چہرہ کفر و شرک کے غبار سے محفوظ رہ سکا نہ قید مقامی
کی روز افزوں پابندیوں نے اسلام کے اخلاقی مقاصد کی غیر شخصی اور عالمگیر
نوعیت کو قائم اور برقرار رہنے دیا، لہٰذا اب کوئی چارۂ کار ہے تو یہ کہ ہم
اس قشر کو جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم گیا ہے اور جس نے زندگی کے ایک ایسے
مطمح نظر کو جو سر تا سر حرکت تھا جامد اور مبتذل بنا رکھا ہے توڑ ڈالیں اور
یوں حرکت، مساوات اور حفظ و استحکامِ انسانیت کی ابدی صداقتوں
کو پھر سے دریافت کرتے ہوئے اپنے سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد
کی تعبیر ان کے حقیقی، صاف و سادہ اور عالم گیر رنگ میں کریں۔....... (ایضاً)

"......بہر حال، ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر
عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن یاد رکھنا

چاہئے، آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے، آزاد
خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے، لہذا نسلیت
اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما
ہیں اس وسیع مطمحِ نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے سلمانوں
کو تلقین کی ہے، پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور
سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک نہیں
عاید کی گئی، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔ ہم کچھ ویسے ہی حالات
سے گذر رہے ہیں جن سے کبھی پروٹسٹنٹ انقلاب کے زمانے میں یورپ کو گذرنا
پڑا تھا، لہذا ہمیں چاہئے کہ ان نتائج کو فراموش نہ کریں جو لوتھر کی تحریک سے
مترتب ہوئے، یوں بھی جب تاریخ کا مطالعہ زیادہ گہری نظر سے کیا جائے
تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ تحریک اصلاح دراصل ایک سیاسی
تحریک تھی جس سے بحیثیت مجموعی یورپ کے لئے کوئی نتیجہ پیدا ہوا تو یہ کہ
مسیحیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ قومی اخلاقیات کے مختلف نظامات نے
لی، لیکن قومی اخلاقیات کا انجام ہم نے جنگ عظیم کی شکل میں دیکھ لیا
جس سے ان دونوں متصادم نظامات میں مفاہمت کے بجائے صورتِ
حالات اور بھی خراب ہو گئی، لہذا عالم اسلام کی قیادت اس وقت
جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کا فرض ہے کہ یورپ کی تاریخ سے سبق
لیں۔ انھیں چاہئے کہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھتے ہوئے اول یہ سمجھنے کی کوشش
کریں کہ بحیثیت ایک نظامِ مدنیت اسلام کے مقاصد کیا ہیں اور پھر آگے

قدم بڑھائیں۔"

(ایضاً)

...... عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے، کائنات کی
روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت
عالمگیر ہو، اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا رہے،
اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید یورپ نے اسی نہج پر متعدد عینی نظامات
قائم کیے، لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت
سے ہو اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل
کی بدولت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسان کو بہت کم متاثر
کیا، برعکس اس کے مذہب کو دیکھئے تو اس نے افراد میں اضافۂ مراتب کیساتھ
ساتھ معاشروں تک کو بدل ڈالا۔ لہذا یورپ کے عینی فلسفہ کو کبھی یہ درجہ
حاصل نہیں ہوا کہ زندگی کا کوئی موثر جزو بن سکے اور اس لئے اب حالت
یہ ہے کہ یورپ کی فساد زدہ خودی باہم دگر حریف جمہوریتوں کی شکل میں
جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینیں،
اپنے تقاضے پورے کر رہی ہے، یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان
کے اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ اور کوئی نہیں، برعکس اس کے مسلمانوں
کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی و تنزیل پر ہے
جسکا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے، لہذا وہ اپنی ظاہری
خارجیت کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے، ہمارے لئے تو
زندگی کی روحانی اساس ایمان و یقین کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک غیر

تعلیم یافتہ مسلمان بھی برضا و رغبت اپنی جان دے دیگا۔ پھر اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیش نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے لہذا اب کوئی ایسی وحی نہیں کہ ہم اس کے مکلف ٹھہریں، ہماری جگہ دنیا کی ان قوموں میں ہونی چاہیئے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ہیں۔ شروع شروع کے مسلمان تو جنھوں نے ایشیاء قبل اسلام کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی اسلام کے اس بنیادی تصور کی ٹھیک ٹھیک حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، لیکن ہمیں چاہیئے آج اپنے اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی از سر نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں تاکہ آئندہ اسکی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشوونما جو اس کا مقصود و منتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔" (ایضاً)

تشکیل جدید پر روشنی ڈالنے والی بے شمار تخلیقات میں سے چند یہ ہیں: منظومات میں تقدیر، توحید، مسلمان کا زوال، معراج، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، سلطانی صوفی سے، تصوف، ہندی اسلام، مستی کردار، مدنیتِ اسلام، امامت، نکتۂ توحید، نبوت، مردِ مسلمان، آزادی، احکام الٰہی، مقصود، مغربی تہذیب، خودی کی تربیت، آزادیِ فکر، اشتراکیت۔ (ضرب کلیم)

یہ اور اس قسم کی بہت سی مثالوں سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں،

۱۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا جو تصور اقبال کے پیش نظر تھا وہ اسلامی نظریہ حیات کے احیاء سے مختلف کوئی چیز نہیں تھی، اقبال عصر حاضر کے انسان کو اسلام کے نام پر

کوئی نئی تشکیل افکار نہیں دینا چاہتے تھے، بلکہ جو بنیادی اصولِ حیات قرآنِ حکیم نے تیرہ صدیوں پیشتر دنیا کو دئے تھے انہی کا علمی احیا اور اطلاق اپنے دور میں کرنا چاہتے تھے، چنانچہ عالم انسانیت کے متعلق اسلام کی بنیادی ہدایات کو وہ اپنے تمام افکار کا مرکز و مرجع قرار دیتے تھے۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں اقبال نے ترکوں کی تحریک کا جو تنقیدی تجزیہ خطبات میں کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب زدہ تجدد کے خلاف تھے اور اس کو ملت اسلامیہ اور انسانیتِ عامہ دونوں کے لئے سخت مضر سمجھتے تھے،

۲۔ اقبال کے افکار کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے اس بات پر پوری طرح غور کرنے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے ان افکار کا اطلاق عملی مسائل پر کس طرح کیا؟ خطبات کے باب الاجتہاد فی الاسلام کے مباحث سے ذیل کے حقائق کی وضاحت ہوتی ہے:

الف۔ قرآن کو اقبال تمام احکام شریعت کے لئے آخری سند تصور کرتے ہیں اور انکا خیال ہے کہ کتاب اللہ نے حیات و کائنات کی بنیادی و عمومی صداقتوں کی ہمیشہ کے لئے تعیین کر دی ہے، اسلئے مسائل حیات کے حل کے لئے جب بھی کوئی اجتہاد ہوگا تو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہی ہوگا، اور انسانی زندگی کا کوئی نقشہ بھی ہو اسی وقت معتبر ہوگا جو قرآن کے تجویز کردہ فکر و عمل کے مطابق ہو۔

ب۔ حدیث ماخذ قانون اسی شکل میں ہو سکتی ہے کہ اس کو جرح و تعدیل کے بعد اور دلیل و حجت کے بعد قبول کیا جائے، البتہ غیر قانونی امور، مثلاً قرآن کی سورتوں کی ترتیب کے سلسلے میں حدیث ہی معیار فیصلہ ہوگی، اس کے لئے حدیث کی حجت کافی ہے۔

ج۔ قانونی اور فقہی امور میں احکام کے استخراج اور مسائل کے استنباط کا حق ان متاخر علماء کو جنکی علمی و دینی قابلیت و بصیرت مسلّم ہے اسی طرح ہے جس طرح علمائے متقدمین

کو تھا، کیونکہ اجتہاد کا دروازہ شرعی طور پر کھلا ہوا ہے اور ہر دور کے فقہاء علماء کو حق ہے کہ وہ
خلوص و دیانت کے ساتھ عصری مسائل کا حل شرعی ہدایات کی روشنی میں ڈھونڈھنے
کی کوشش کریں، قیاس و اجماع کے اصول ہر زمانے کے لئے یکساں قابل عمل ہیں۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ اقبال نے نہ صرف نظام شریعت کیخلاف کسی مسئلے میں کوئی
اقدام نہیں کیا، بلکہ اس دور کے تجدد پسند وسیع ترکی وغیرہ میں جو اقدامات کئے ہیں ان پر
سخت تنقید و تردید کی۔

۳۔ اقبال نے تشکیل جدید کا جو نہج تجویز کیا ہے اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ یونانی فکر اور
اس پر مبنی مغربی نظام فکر کو قرآنی و اسلامی نظریے کے بالکل متضاد سمجھتے ہیں، انکے نزدیک
یونانی فکر محض خیالی ہے اور اسلامی فکر حقیقی ہے، اول الذکر طلسم خیالات میں اسیر ہے
اور ثانی الذکر حقائق زندگی پر قائم ہے، یونانی فلسفہ تجریدی ہے، قرآنی تصور تجربی۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

(مدنیت اسلام۔ ضرب کلیم)

اس لئے یونانی فکر، قرآنی فکر کے مقابلے میں فروتر ہے، اور عالم انسانیت کی تشکیل نو
کے لئے اسلامی فکر ہی موزوں و مفید ہے، اس حقیقت کے پیش نظر اقبال نے بھی اعلان
کیا ہے کہ جدید تہذیب میں بحیثیت تجربیت کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ صرف اسلام
اور مسلمانوں کی دین ہیں، مگر کلیسائی اخلاق نے مغرب میں ان عناصر کو بھی مسخ کرکے
رکھ دیا اور مادی ترقی نے، اس بنیادی خرابی کے باعث، عالم انسانیت کو تباہی کے
دہانے پر کھڑا کر دیا ہے، جس سے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی نظریۂ

حیات کو رائج کیا جائے۔

۴۔ اسلامی نظریۂ کائنات ایک مرکب اور متحرک تصور ہے جو ارتقاپذیر کائنات
کے ہر مرحلے میں انسان کے جدید ترین احساسات کی ترجمانی اور تنظیم اس طرح کر سکتا ہے،
کہ انفس و آفاق کے متعلق کی جانے والی تمام سائنسی تحقیقات کو اپنے اندر سمولے اور انکا بہترین
اطلاق مسائل حیات پر کرے، یہ ایک جامع اور ترقی پذیر نظام فکر ہے، جو اپنی الہیاتی اور
روحانی بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے ہر دور کی مادی ترقیات کی صحیح سمت متعین کر سکتا ہے۔

۵۔ اسلام کی جامعیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ عملی و تجربی ہونے کے ساتھ ساتھ
وہ قلبی واردات اور ذہنی تصورات کا بھی محرک ہے، اس میں عقل اور عشق دونوں کا
متوازن امتزاج اور روحانی و مادی کوائف کا کامل اعتدال ہے، اسلام دنیا و آخرت
اور دین و سیاست کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتا، اور فرد و معاشرہ کے مابین مکمل
موافقت پیدا کرنا چاہتا ہے، اسمیں مذہب اور ریاست دونوں ایک ہی حقیقت کے دو
رخ ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کیلئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(دین و سیاست۔ بال جبریل)

۶۔ اسلام انسانیت عامہ کا پیغام پیش کرتا ہے، اس کے اصول آفاقی ہیں، رنگ ونسل، وطن اور فرقہ وطبقہ کی تفریق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ایک نظریاتی تحریک ہے، روایتی مذہب نہیں، ایک نظامِ فکر وعمل ہے، رسوم واوہام کا ادارہ نہیں،

عام حریت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے ——— اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

(دنیائے اسلام، خضر راہ)

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو ——— اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی ——— تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

(طلوعِ اسلام)

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود ——— اسلام کا مقصود فقط وحدتِ آدم

۷۔ انسانی ترقی کی کوئی حد انسانیت کے سوا نہیں، خدا کی خدائی اور اپنی بندگی کی حد میں مادی و روحانی ترقیات کے بہت سے امکانات اب بھی انسانوں میں مضمر ہیں، خلافتِ الٰہی کے قرآنی تصور نے اس کی قوتوں اور فضیلتوں کو انتہائی حد تک بڑھا دیا ہے، مستقبل کے انسان کو ارتقا کے بہت سے ایسے مدارج طے کرنے ہیں جن کا تصور بھی مادہ پرست سائنس داں نہیں کر سکتے، معراجِ محمدیؐ نے انسانی ترقی کا آخری سنگِ میل نصب کر دیا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے ——— کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ——— ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(پوری غزل — بالِ جبریل)

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے ——— نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے

(ساقی نامہ)

اسلامی فکر کے اس پیکر کو اقبال نے "مردِ کامل" یا "مردِ مومن" سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تعریف و توصیف میں بکثرت اشعار کہے ہیں، "مسجد قرطبہ" کے بند ۴، ۵ اور ضربِ کلیم کی نظم "مردِ مسلمان" اس شخصیت کا نہایت ولولہ انگیز تعارف ہے، یہ شخصیت مثالی اوصاف کی حامل ہے، لیکن یہ کوئی خیالی تصور نہیں، اور عالمِ واقعہ میں اس کا ظہور صرف ماضی میں ہو چکا ہے، بلکہ ہر دور میں ہو سکتا ہے، کمال کا مطلب حدودِ انسانیت سے ماورا ہو جانا نہیں بلکہ ان حدود کے اندر انسانیت کے امکانات کو عروج تک پہنچانا ہی کمال ہے،

۹۔ "مردِ مومن" کا کوئی تعلق ڈارون کے "بقائے اصلح" سے نہیں ہے، اگرچہ اقبال نے ابن مسکویہ کے حوالے سے خطبات میں ارتقائے حیات کا ذکر کیا ہے، لیکن کسی تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کائنات کے تخلیقی نظریہ کے مقابلے میں اس مادی ارتقا کے قائل تھے جو ڈارون سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف اقبال کی نظم ونثر سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ وہ الوہی تخلیق ہی پر ایمان رکھتے تھے، ارتقا کے جو تصورات ان کے یہاں پائے جاتے ہیں وہ تخلیقی ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہیں، میکانکی کی طرف نہیں، کائنات بلاشبہ اقبال کے نزدیک ایک متحرک اور ترقی پذیر وجود ہے، لیکن مشیتِ خداوندی کے تحت اور ایک الوہی منصوبے کے مطابق اور اس کی قوتِ محرکہ روح ہے، نہ کہ مادہ، ارتقا کے سلسلے میں اقبال کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ مارکس کی معاشی جدلیات کے برعکس تاریخ کی حرکت خیر و شر کی رزم آرائی پر مشتمل ہے، اور مومن ایسی صالح شخصیت کا مالک ہے، جو شر کے مقابلے میں خیر کی علمبردار ہے،

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
(ارتقا: بانگِ درا)

قیام خیر کیلئے اسی کاوش و جد و جہد کو اقبال جہاد کہتے ہیں اور اسی کے لئے قوت و شوکت کے حصول کا پیغام دیتے ہیں،

۱۰۔ مرد مومن کی خودی سلطانی اور تعمیری ہوتی ہے، اور غیر مومن کی ناسلطانی اور [illegible] تخریبی ہوتی ہے، سلطانی خودی جب بیدار اور فعال ہوتی ہے تو "تقدیر" بھی اس کی راہ میں روک نہیں بنتی اور بندے کا ارادہ خدا کے ارادے کا پابند ہو جاتا ہے، اس لئے اس کی تدبیر اور تقدیر کے درمیان عملاً کوئی فرق نہیں رہ جاتا، وہ صرف احکام خداوندی کی پیروی کرتا ہے، اور اس کو پورا اعتماد ہوتا ہے کہ "کارساز ما بہ فکر کار ما"!

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

(احکام الٰہی: ضرب کلیم)

اس مقام پر پہنچ کر مومن کے "ارادے" "قدرت کے مقاصد کا عیار" بن جاتے ہیں اور "خدا کی تقدیر" مومن کے "ارادوں" میں "پنہاں" ہو جاتی ہے، اور قدرت کے مقاصد ہی کو حاصل کرنے کے لئے مومن سلطنت و حکومت کا قیام عمل میں لاتا ہے اور اس اقتدار کو منشائے الٰہی کے مطابق استعمال کر کے "ظل سبحانی" کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے،

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

(سلطانی: ضرب کلیم)

اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے سلسلے میں اقبال کے تصورات کے متعلق وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کوئی بات اسلامی مسلمات کے خلاف نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ اقبال نے کسی خاص مکتب فکر کی تقلید کرنے کی بجائے اجتہاد سے کام لیا ہے اور اپنے غور و فکر کے نتائج ایک خاص اسلوب سے پیش کئے ہیں، اور انکا پیش کردہ یہ نظام فکر اسلامی مسلمات پر مبنی ہونے کے باوجود جدید ترین انسانی تحقیقات پر مشتمل ہے

یعنی اقبال نے اسلامی اصولوں کی ترجمانی عصر حاضر کی اصطلاحات میں کی ہے اسی لئے ہم اس کو اسلامی فکر کی تشکیل جدید کہتے ہیں، یہ ہے فکر اقبال کے نظریات و تصورات کی بنیادی نوعیت ممکن ہے بعض میلانات کے اعتبار سے فکر اقبال کے کچھ پہلو ایسے بھی ہوں جو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے محل نظر ہوں، لیکن انکا تعلق اسلام کے بنیادی اصولوں سے نہیں ہے، بلکہ فروعی ہیں جنمیں تعبیر و تشریح کے اختلافات ہر دور میں رہے ہیں۔

مسعود بکؒ

ہندوستان کے حسین بن منصور حلاجؒ

از جناب لطاف حسین خاں صاحب شروانی، اسلامیہ کالج اٹاوہ

مسعود بکؒ ہندوستان کے ایک مشہور اہل دل شاعر گذرے ہیں، یہ شیخ رکن الدینؒ ابن شہاب الدین امامؒ سے بیعت تھے، انکو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے بھی عقیدت تھی، اپنے ایک شعر میں اسکا اظہار کیا ہے، ؎

شاہنشاہے جہانِ لطافت نصیر دیں — کو دادِ حسن از رخ خود ایں دیار را

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے Ency. of Islam میں اپنے ایک مقالے میں چشتیہ سلسلہ کا جو شجرہ دیا ہے اس کے آخری رکن مسعود بکؒ ہیں، مسعود بکؒ کے بعد کے خلفاء کے سلسلہ میں میری نظر میں تمام تذکرے خاموش ہیں، البتہ گلزار ابرار میں ایک موقع پر ضمناً مسعود بکؒ کے خلیفہ کا تذکرہ آگیا ہے، محمد غوثی فرماتے ہیں:-

"یادِ شیخ بہاؤ الدین شاہ باجن" یہاں سے شہر بیدر میں پہونچے، بیدر میں شیخ مجلے تھے جو منصور زماں مسعود بک کے خلیفہ تھے، ان کی ملازمت میں آپ نے چلہ کشی کی، ایسی مقبولیت پیدا ہوئی کہ مسعود بک کا خرقہ عنایت ہوگیا، پھر آپ گجرات لوٹے"[ا]

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے چشتیہ سلسلہ کا جو شجرہ[۳] تحریر فرمایا ہے اس کا آخری حصہ یوں ہے :-

---

نوٹ :- حاشیہ ص ۲۰۷ پر ملاحظہ ہو،

(حضرت نظام الدین اولیاؒ (متوفی ۱۳۲۵ء))

شہاب الدین امام، علاء الدین نیلیؒ، فخر الدین زرادی، قاضی محی الدین کاشانی متوفی ۱۳۱۹ء، شمس الدین یحییٰ متوفی ۱۳۴۷ء، مولانا مغیر الدین متوفی ۱۳۲۵ء، نصیر الدین چراغ دہلوی متوفی ۱۳۵۶ء

رکن الدینؒ

مسعود بکؒ (متوفی ۱۴۳۲ء)

مسعود بکؒ کا تذکرہ معاصر ماخذوں میں بہت کم ملتا ہے، درویشوں کے ملفوظات میں کہیں کہیں نام نظر آتا ہے، بعد کے تذکروں میں معارج الولایت، گلزار ابرار اور اخبار الاخیار میں انکا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے ہے، متاخرین میں تکملہ سیر الاولیاء مصنفہ خواجہ گل محمد احمد پوری (مطبوعہ دہلی، ۱۳۱۶ء) میں کچھ واقعات ملتے ہیں، شعراء کے فارسی تذکروں میں انکا کہیں ذکر نہیں ہے،

ان کے نام کے بارے میں اختلاف[ا] ہے، اصل نام شیر خاں تھا، مسعود بک کے نام سے مشہور ہوئے، بخارا کے قریب ایک مقام بک سے انکا تعلق تھا، سلطان فیروز شاہ تغلق کے عزیزوں[۲] میں تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶) [ا] گلزار ابرار کے مؤلف نے ایک موقع پر منصور زماں مسعود بک لکھا ہے، دیکھئے ترجمہ، ص ۲۱۴، [۲] ترجمہ، ص ۲۱۴، [۳] تفصیل کے لئے دیکھئے؛

Ency. of Islam vol. ii (London -1965-67) P 51,

[ا] گلزار ابرار، ترجمہ، ص ۴۹۲ میں مسعود بیگ، تکملہ سیر اولیاء، ص ۲۴ میں خواجہ مسعود بکؒ اور قاموس المشاہیر جلد دوم، ص ۲۱۳ میں مسعود خواجہ درج ہے، [۲] مبلغ الرجال (مخطوطہ) کے مؤلف نے خواہرزادہ سلطان الشہید فیروز شاہ لکھا ہے، مولانا آزاد لائبریری شعبۂ مخطوطات حبیب گنج کلکشن، فارسیہ نمبر ۱۹۱، ص ۲۵ ب،

مسعود بکؒ نے جاہ و ثروت سے منہ موڑ کر فقر و درویشی کی زندگی اختیار کی تھی[۱]، انکا پورا دیوان پڑھ جائیے زندگی کے حالات کہیں نہیں ملتے، وہ مست شراب لایزالی سر حلقۂ عاشقان لاابالی تھے[۲]، ان کو اس کا دھیان کہاں تھا کہ اپنے حالات بیان کرتے۔

نظریۂ وحدت الوجود اور مسعود بکؒ

مسعود بکؒ حضرت امام اکبر کے نظریۂ وحدت الوجود سے متاثر تھے، اس سے ان کے کلام میں ایسی مستی پیدا ہوگئی تھی کہ چشتیہ سلسلہ کے کسی بزرگ نے اسرار حقیقت کا ایسا انکشاف نہیں کیا جیسا مسعود بک نے کیا، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں "در سلسلہ چشتیہ ہیچ کس ایں چنیں اسرار حقیقت فاش نگفتہ دستی نکردہ کہ او کردہ"[۳] ان کا یہ بھی بیان ہے کہ مسعود بکؒ کے آنسو اتنے گرم ہوتے کہ اگر کسی کے ہاتھ پر گر پڑتے تو اس کا ہاتھ جل جاتا تھا[۴] صوفیائے کرام ان کا کلام دروازہ بند کر کے سنا کرتے تھے کہ عوام کے کانوں تک نہ پہونچنے پائے، مگر خود مسعود بکؒ اپنا کلام بلا تکلف عوام کو سناتے تھے، پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی فرماتے ہیں:

"مسعود بکؒ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں وحدت الوجود کے خیالات کو اپنے اشعار اور تصانیف میں عوام تک پہونچانا شروع کر دیا"[۵]

[۱] گلزار ابرار کے مؤلف لکھتے ہیں سپاہیانہ وضع تھی، ظاہری علم اور فضیلت کی تحصیل سے کوئی حصہ نہیں ملا تھا، چراغ دہلی کی خدمت سے آپ کی دانش وبینش کی شمع روشن ہوئی تھی اور آپ کاملوں کے درجہ پر پہونچے، ص ۴۹۱، ۴۹۲، [۲] تکملہ سیر الاولیا ص ۲۴، [۳] اخبار الاخیار، ص ۱۶۹، [۴] ایضاً [۵] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۳۸۸، ۳۸۹،

مسعود بکؒ مسئلہ توحید پر اعلانیہ گفتگو کرتے تھے اسلئے علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیدیا۔[۱] یہ الگ بحث ہے کہ یہ فتویٰ کہاں تک صحیح تھا، لیکن جہاں تک شریعت کا سوال ہے، ان باتوں سے عوام کے عقائد میں فساد پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اسلئے سلاطین وقت نے سختی برتی اور صوفیائے کرام اس سے واقف تھے اس لئے مسئلہ وحدت الوجود کو خواص کی مجلسوں میں بیان فرماتے، عوام کے سامنے نہ بیان کرتے،

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے صحیح تجزیہ فرمایا ہے:

"سب سے پہلے ہندوستان میں جس بزرگ نے وحدت الوجود کو عام گفتگو کا مبحث بنایا وہ مسعود بکؒ تھے، یہ فیروز تغلق کا زمانہ تھا، عوام کو اس گفتگو میں شریک کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "انا الحق" کی صدائیں بلند ہونے لگیں ...... جاہل انسانوں سے ان ہی صداؤں کا اندیشہ تھا جسکی وجہ سے مشائخ اسلام نے مسئلہ وحدت الوجود پر بحث کرنے کی مخالفت کر دی تھی' ان حالات میں شریعت کا سارا نظام درہم برہم اور اسلامی سوسائٹی کا شیرازہ منتشر ہوجانے کا خطرہ تھا، فیروز شاہ نے حالات کی نزاکت کو سمجھا اور اس قسم کے لوگوں کو سخت سزائیں دیں"[۲]

[۱] وحدت الوجود کے سلسلہ میں دیکھئے، تعارف، پروفیسر محمد حبیب، تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۹۔۳۲،

آں انا بیوقت گفتن لعنت است — واں انا در وقت گفتن رحمت است

یہاں پہلے آں کا اشارہ فرعون کی طرف ہے اور دوسرے کا منصور کی طرف۔

[۲] تاریخی مقالات، ص ۳۴،

شہادت چنانچہ پہلے علماء نے یہ کوشش کی کہ شاہی دربار اور عوام مسعود بکؒ کے کلام سے محفوظ رہیں لیکن مسعود بکؒ جب عوام کے حلقہ تک اپنے خیالات پہونچانے لگے تو ان پر کفر کا فتویٰ دیا گیا اور وہ قتل کر دیئے گئے، اس کے متعلق محمد بولاق نے صرف اتنا ہی لکھا ہے" انکے ہم عصر علماء کو ان سے بڑی عداوت تھی چنانچہ ان کے فتویٰ پر حسین منصور کی طرح ان کو قتل کر دیا گیا"[1]

واقعہ شہادت کی تفصیل خواجہ گل محمد احمد پوری نے اپنے تذکرے میں دی ہے اس کو انھیں کے الفاظ میں سنئے،

"منقول است از حضرت غریب پرور رضی اللہ عنہ کہ روزے حضرت مسعود بک نعلین برائے شیخ خود می آورد یکے عالمے در راہ ملاقی شد پرسید کہ کفش کدام کس برداشتہ آید فرمودند کہ کفش حق تعالیٰ برداشتہ ام علمائے ظاہر متفق شدہ زیر قلعہ فیروزہ آباد برلب جون آنحضرت را شہید ساختہ اعضاء مبارک او را پارچہ پارچہ کردہ در آب انداختند بعد از وقوع ایں قضیہ ہرچند معتقدان و احباء در آب جون انداختند اثرے ازاں نیافتند بعد از سہ روز بسیار جمیع اعضائے او جمع شدہ مجسم گردیدہ در حجرہ خاص حضرت سلطان المشائخ رضی اللہ عنہم در کیلوکھری یافتند از انجا برداشتہ در مقبرہ پیران قریب مقام خواجہ قطب الاسلام بختیار اوشی در لادو سرائی مدفون ساختند چوں ایں خبر بحضرت شیخ سید قاضی را فرمودند کہ بکدام مسئلہ شیخ شہید کردہ اند قاضی گفت کہ حق تعالیٰ را پای ثابت کردہ بود حضرت

---

[1] روضۃ الاقطاب، ص ۸۸،

فرمود کہ اضافت برای ادنیٰ ملابست درست است شما پرسیدہ بود کہ کفش خدائے تعالیٰ برای مالکیت حق تعالیٰ میگفت کہ للہ ما فی السموات والارض یا حق تعالیٰ را لابس کفش میگفت قاضی از جواب عاری شد پس آنحضرت را جوش آمد فرمودند اے رو سیاہ فی الحال روئے قاضی سیاہ و حالش تباہ گردید"[1]

مسعود بکؒ کی گمنامی مسعود بک فارسی کے اچھے شاعر تھے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تذکرہ نگاروں نے ان کی طرف سے اتنی بے اعتنائی کیوں برتی، حالانکہ یہی الزام منصور پر بھی تھا، لیکن فارسی ادب میں نظم ہو یا نثر، تذکرہ ہو یا تاریخ منصور کا نام ہر جگہ نظر آتا ہے، غالباً مسعود بکؒ کے ہمعصر تذکرہ نگاروں نے مذہب اور حکومت کے دباؤ سے ان کو نظر انداز کر دیا، مگر تعجب کہ صوفیائے کرام کے ملفوظات بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے اخبار الاخیار میں تفصیل سے انکا تذکرہ کیا ہے، پھر جہانگیر کے عہد کے تذکرہ نگار محمد غوثی نے گلزار ابرار میں انکا مختصر حال لکھا ہے، جہاں تک مجھے علم ہے آج تک بھی ہندوستان میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے علاوہ کسی محقق یا مورخ نے ان پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی،

تصانیف حسب ذیل تصانیف ان کی جانب منسوب ہیں،

(۱) دیوان نور العین: اسکا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے، عرصہ ہوا دیوان نور العین شائع ہوا تھا اب نایاب ہے، مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ میں بھی دیوان مسعود بک

---

[1] تکملہ سیر اولیاء، مصنفہ خواجہ گل محمد احمد پوری، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۲ھ، ص ۲۵۳، ۲۵۴ [2] میں نے اپنے استاد حافظ غلام مرتضیٰ صاحب الہ آباد یونیورسٹی کا ایک مقالہ اسلامی فکر میں وحدت الوجود کا نظریہ بڑے ذوق سے پڑھا لیکن مجھے بڑی ناامیدی ہوئی جب ایسے وحدت الوجود سے متاثر صوفیائے کرام میں مسعود بک کا نام نہ پایا،

کے نام سے ایک قلمی نسخہ موجود ہے[۱]

(۲) مراۃ العارفین: صوفیائے کرام اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، گلزار ابرار کا مولف لکھتا ہے: "جن ایام میں راوی بدایہ قاضی محمود سے اور قاضی محمود نقد فصوص اور مراۃ العارفین اس درویش سے پڑھتے تھے تو آپ (قاضی محمود موربی) کو ایک مسئلہ کلام میں سخت دشواری پیش آئی"[۲]

(۳) تنزیہ العقاید: اس تصنیف کا ذکر مبلغ الرجال کے موتلف نے کیا ہے، حضرت خواجہ عبد اللہ المعروف بہ خواجہ کلاں فرماتے ہیں:

"شیخ شہاب الدین مسعود بک خواہرزادہ سلطان الشہید فیروز شاہ بن سالار

رجب در رسالہ تنزیہ العقاید می گفت" ص ۲۵ ب،

(۴) حاشیہ تمہیدات عین القضات ہمدانی:[۳]

نمونۂ کلام

روح مست و قلب مست و عقل مست و عشق مست
از نسیم شاہ شدہ ایں نفس وردی خوار مست

روح مست و عرش مست و کفر مست و اسلام مست
واز شراب لایزالی مومن و کفار مست

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۱) دیکھئے معارف مارچ ۱۹۶۰ء مولانا آزاد لائبریری علیگڈھ کے شعبۂ اردو کے میگزینوں کی فہرست مرتب کرنے کے سلسلہ میں تقریباً سو سال کی تمام میگزینیں دیکھیں مگر کسی میں بھی مسعود بک کے سلسلہ میں کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔

[۱] مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ حبیب گنج کلکشن، مکتوبہ حبیب اللہ، عہد بادشاہ فرخ سیر، نمبر ۱۷/۴۴، [۲] ترجمہ ص ۳۶۹،

[۳] دیکھئے: سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (حاشیہ) ص ۴۱۲ "گلزار ابرار کے مؤلف نے انکے دوسرے رسالوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن نام نہیں لکھے: بہت سے رسالے عربی اور فارسی میں آپ کی طرف منسوب ہیں" ص ۹۲۴،

زلف او از کفر مست و رویش از اسلام مست
شکل مست و حسن مست و غمزہ مست و یار مست

مسعود بک چگونہ سلامت بری تو جاں
ہندوی خان باز چوں ترکاں کمیں گرفت

بودند شاہ ملک و صفا خواجگان چشت
مسعود بک ولایت ایشاں فرو گرفت

مکتوبات خواجہ محمد معصوم رح اور تکملۂ سیر اولیا میں درج ذیل شعر ملاحظہ ہوں،

رفت ز مسعود بک جملہ صفات بشر
او کہ ہماں ذات بود باز ہماں ذات شد

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری
ہر لحظہ مرا تازہ خدائی دگر ست

ای الٰہی کاندرون جان ہر انساں توئی — ظلمت کفر ست از تو نور ہر ایماں توئی

تابش معنی ز تست و حسن ہر صورت ترا ست — بلکہ در صورت بمعنی حسن تاباں توئی

کعبہ را بتخانہ سازی دیر را مسجد کنی — مومناں را دیں توئی کفر را شایاں توئی

بت پرستی و نماز و کعبہ و دیر مغاں — نزد من یکساں ست چوں در نفس ظلمت ہا توئی

نور خدا ست روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم — ملک بقا ست برای محمد صلی اللہ علیہ وسلم

محرم راز خفای الٰہی ہمدم مجلس نا متناہی — بر ہمہ عالم یافتہ شاہی صلی اللہ علیہ وسلم

خاتم ملکش میم محبت تاج کلاہش نون نبوت — بر سر عالم سایۂ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

اسم محمد اوست مسمیٰ قسمہ تقیس دارد اسما — اسم مسمیٰ زو شدہ شیدا صلی اللہ علیہ وسلم

حسن او در جمال دل بینی   لیک چون صاف بر فرمی رد
گرچه ابلیس ہست دشمن دیں   گر ہما نی فرشتہ یار شود
ساربان اکشد زمستی خون   اشتر مست بی مہار شود
چشم چون ابر زار خون افشان   تا خزان دولت بہار شود
در ہمہ کل جمال اوست نہان   رو نماید چہ وقت کار شود
کل شود میوہ میوہ تخم دہد   گر بکاری شجر دو بار شود

ساقی مست من بدہ بادۂ عاشقانہ را   از دل خستہ دور کن درد وغم وزنار را
جان ہمہ توبستۂ درخم زلف ہر شکن   کے بر ہم زین محن تا نکنی تو شانہ را
ساقی جان محمد است کہ بدہد اخر ابو   بر کشد از وجود من صورت خسروانہ را
آب حیات جاودان آمدہ درمیان جان   مطرب خوش نوائی من کردہ چو بر ترانہ را

فاتح ارواح بیا کوکب مصباح بیا   جذبہ فتاح بیا تابش انوار بیا
روشنی روح بیا حادثہ نوح بیا   عالم مفتوح بیا تابش انوار بیا
کعبۂ حاجات توئی پیر مناجات توئی   مست خرابات توئی جانب اسرار تو بیا
بوی بیا عود بر و نور بیا دور برد   پردہ مستور برو مژدۂ دیدار بیا

ای آفتاب حسن برافگن نقاب را   بی تاب کرد این دل وجانِ خراب را
آں زلف دلفریب کہ بر رخ فگندۂ   در شب نمودۂ مہ من آفتاب را

یاران ہمہ مشغول تسبیح و تہلیل   من سجدہ کنان پیش بتان در ہمہ آفات
ہر نکتۂ من آیت اسرار الٰہی است   در فہم تو با آنکہ نماید ز محالات

حسن جمال صورت خوبانِ نازنین   صاحب نظر زپرتو نور خدا گرفت

امروز دریں خرقہ تن بار بر آمد   خورشید حقیقت بشب تار بر آمد
از بس کہ یکی گشت دو چشم بجبانش   ہر جا ز طرف صورتِ دلدار بر آمد

بیا بیا کہ زخنجر بجان خلید فراق   نہاں عقل بکلی ز جان برید فراق
بیا نسیم بہاری وصال ازاں گلشن   کہ بر حدیقۂ دل چون خزان برید فراق

ایں چشم شوخ کرد نظر بر جمال او   رویش سیاہ ساختہ مردم بریں نگاہ
مسعود بکؒ کہ سرکش آفاق حسن بود   بر خاک آستانش نکندہ ز سر کلاہ

ما جانب اغیار چرا می بینیم   پیوستہ چو او ہست بصیر دل ما

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۸)

میر معصوم نامی امشب بتمنائے مہ روے تو تا روز — چشمم چو در خانہ ویران شدہ باز است

آج کی رات تیرے چاند سے چہرہ کی تمنا میں میری آنکھیں دن تک ویران مکان کے دروازے کی طرح کھلی رہیں، کیونکہ ویران مکان کا دروازہ کوئی نہیں بند کرتا، اس سے دل کی ویرانی کی طرف بھی اشارہ ہوگیا،

میر نجات بست است بردم مژہ چشم سیاہش — خوں کردہ در بستہ نشست است نگاہش

کنایہ ہے کہ محبوب کسی پر نگاہ نہیں ڈالتا، اسکی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے کہ اس کی آنکھوں نے لوگوں پر راستہ بند کر دیا ہے (یعنی کسی کی طرف نہیں دیکھتا) اسکا سبب یہ ہے کہ اسکی نگاہ نے (یعنی) لوگوں کا خون کیا ہے، اسلئے دروازہ بند کرکے چھپ کر بیٹھی ہے،

براہ عاشقی پروانہ باشد رہنمائے من — بسوزم بہر یارے کو بسوزد از برائے من

عاشقی کے راستہ میں پروانہ میرا رہنما ہے، اس کی طرح میں بھی اس محبوب کے لئے جلتا ہوں جو میرے لئے جلتا ہے، جیسے شمع پروانہ کے لئے جلتی ہے،

محمد میر نظمی خدنگ غمزہ بہ نظمی زدی واہ کشید — زبان بریدہ مگر آفریں نمی دانست

تو نے نظمی پر غمزہ کا تیر چلایا، اس نے درد سے آہ کی، وہ زبان بریدہ غریب آفریں کہنا

نہیں جانتا تھا ورنہ اس کو تو آہ کے بجائے تحسین و آفریں کرنا چاہئے تھا،

ذکی جونی وجد و منع بادہ اے صوفی چہ کافر نعمتیست — منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

صوفی سے کہتا ہے کہ تو خود تو وجد و حال میں مست رہتا ہے اور لوگوں کو شراب سے منع کرتا ہے، آخر یہ کون سا کفران نعمت ہے کہ شراب سے تو انکار ہے اور زندگی مستوں جیسی ہے،

نیکی صفاہانی اے کہ دستے می نہی بر دل کہ بینی حال جیست — ساعتے بنشیں کہ زیں ذوقم دل از جا رفتہ است

تو میرا حال معلوم کرنے کے لئے دل پر ہاتھ رکھ رہا ہے، تھوڑی دیر ٹھہر جا کہ تیرے ہاتھ رکھنے کی لذت میں دل اپنی جگہ پر نہیں رہ گیا ہے، (وہ اپنی جگہ پر آجائے اسوقت اندازہ ہوگا)

مرزا انور اللہ نہ مروت است مارا بہ مراد خود رسانند — کہ ہزار نا امیدی بہ امید ما نشستہ

مجھکو میری مراد تک پہنچا دینا مروت کے خلاف ہے، کیونکہ ہزاروں نا امیدیاں میری مراد کی تاک میں بیٹھی ہیں کہ جیسے ہی وہ پوری ہو اسکو نا امیدی سے بدل دیں، اسلئے میری مراد کو پوری کرنا نا امیدی کو دعوت دینا ہے،

ناظم تبریزی بسکہ جاں را در دم بسمل بہ رغبت می دہم — رشک بر من می برد آنکس کہ جلاد من است

تڑپتے وقت اس ذوق و شوق سے جان دے رہا ہوں کہ اسکو دیکھ کر جلاد کو بھی میری موت پر رشک آجاتا ہے،

نادم لاہیجی کشتی مرا و کشتہ شد از رشک عالمے — ہر خوں کہ میکنی تو بصد خوں برابر است

تو نے مجھکو قتل کیا اس رشک میں ایک عالم مر گیا، اس لئے تیرا ایک خون کرنا سیکڑوں خونوں کے برابر ہے،

دانش مشہدی بیروں میا ز خانہ کہ ذوق امید وصل — بہتر ز دیدنی است کہ بیہوشی آورد

تو گھر سے باہر نہ نکل کہ تیرے وصل کی امید کی لذت تیرے دیدار سے بہتر ہے تیرا دیدار

بیہوش کر دیتا ہے، اس لئے لطفِ دید بھی حاصل نہیں ہوتا اور امید میں ایک لذت ہوتی ہے اسلئے
اس کو قائم رہنے دے

بُراِلقی، آمدی بر سرِ خاکِ من و شرمندہ شدم — کیں زماں از پئے قربانِ تو جاں بایست

تو میرے مرنے کے بعد میری قبر پر آیا اور مجھے یہ شرمندگی ہے کہ یہ وہ مبارک ساعت ہے کہ
تجھ پر قربان کرنے کے لئے جان کی ضرورت تھی جواب باقی نہیں ہے،

سرِ شک از رخم پاک کردن چہ حاصل — علاجے بکن کز دلم خوں نہ آید

میرے چہرے سے آنسو پوچھنے سے کیا حاصل، کوئی ایسا علاج کر کہ دل کے زخم سے خون
نہ نکلے، ورنہ آنسو برابر بہتے رہیں گے،

طبیبم آں چناں از دلسوزی و منت میکند درماں — کہ پندارد من بیچارہ میل زیستن دارم

میرا طبیب اس دلسوزی اور منت سے علاج کر رہا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے زندہ رہنے
کی تمنا ہے، (حالانکہ میں زندگی سے بیزار ہوں)

وقتِ مردن چشم بکشا و آنگہے رویش ببیں — راہ دوری میروی اندیشۂ زادے بکن

مرتے وقت آنکھ کھول کر اسکا چہرہ دیکھ لے کیونکہ تیرا سفر دور دراز کا ہے، اس لئے
زادِ راہ کی فکر کرنی چاہئے، (اس کے چہرہ کی یاد زادِ راہ کا کام دیگی)

اے عشق خوار ترکن از ہیں ہم بکوئے او — تا ہر کہ بیندم نکند میل سوئے او

اے عشق میں اس کے کوچہ میں جس قدر ذلیل و رسوا ہوں اس سے بھی زیادہ رسوا کر
تاکہ جو شخص مجھ کو دیکھے پھر اسکی طرف رخ نہ کرے،

ناصح ملامتم کند و من دریں خیال — کامروز بگذرم بچہ تقریب سوئے او

ناصح تو مجھ کو ملامت کرتا ہے، اور میں اس فکر میں ہوں کہ آج کس تقریب سے اس کی گلی

میں جاؤں،

کمال الدین خجندی

بلبلِ گلشن پرستم لیکنم پر باز نیست — باغ نزدیک ست اما طاقتِ پرواز نیست

میں گلشن پرست بلبل ہوں لیکن میرے پر کھلے نہیں ہیں، باغ تو قریب ہی ہے، مگر افسوس کہ پرواز
کی طاقت نہیں ہے،

مریضِ طفل مزاج اند عاشقاں ورنہ — علاجِ رنجِ تغافل دو روزہ پرہیز ست

عاشقوں کا مزاج بیمار بچوں جیسا ہے (جو بیماری میں مشکل سے پرہیز کرتے ہیں) ورنہ
محبوب کے تغافل کا علاج دو روزہ پرہیز ہے، یعنی اگر دو دن کے لئے بھی اس کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا
تغافل دور ہو جائے، لیکن عشاق کی بے صبری سے یہ پرہیز نہیں ہو سکتا،

تو منکری و لیک بمن مہربانیت — می بارد از ادائے نگاہ نہانیت

اگرچہ تجھکو انکار ہے لیکن میرے حال پر تیری مہربانی تیری نگاہ پنہاں کی ادا سے برستی ہے

جائے ہنوز نیست بذوقِ دیارِ عشق — ہر چند ظلم ہست، ستم ہست داد ہست

دنیائے عشق میں ظلم و ستم داد فریاد سب کچھ ہے، پھر بھی عشاق کے ذوق کی تسکین کا سامان
نہیں ہے، وہ کچھ اس سے بھی سوا چاہتے ہیں،

فرماندہیِ کشورِ دل کارِ بزرگ ست — از دولتِ حسنِ تو ازیں کار نہ آید

اقلیم دل کی حکمرانی بڑا بھاری کام ہے، تیرے حسن کی حکومت سے یہ کام انجام نہیں پاسکتا
یعنی تو اسکی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرسکتا،

رسم کجاست ایں تو بگو در کدام شہر — دل می برند و چشم بیالا نمی کنند

تم ہی بتاؤ یہ دستور کہاں ہے اور کس شہر میں ہے کہ دل اڑا لیجاتے ہیں اور نگاہ اٹھاکر
نہیں دیکھتے؛

دعاہاے سحر گویند میدارد اثر وحشی — اثر می دارد اما کے شب ہجراں سحر دارد

وحشی! لوگ کہتے ہیں کہ دعاے سحری میں اثر ہوتا ہے، بیشک اثر ہوتا ہے، لیکن شب ہجراں
کی سحر ہی کہاں ہوتی ہے، کہ دعا کی جائے اور اس کا اثر ظاہر ہو،

می آید از گشادنِ در بوئے منتے — در بستہ باغ خلد بر رضواں گذاشتیم

کسی کے بند دروازہ کھولنے میں احسان کی بو آتی ہے، (میری خودداری جسکے قبول کی
اجازت نہیں دیتی) اس لئے میں نے باغ خلد کو بھی جس کے دروازے بند ہیں رضواں کیلئے چھوڑ دیا،

غالبؔ کا یہ شعر

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے

زیمنِ عشق بر وضعِ جہاں خوش خندہ ام — معاذ اللہ اگر روزے بدستِ روزگار افتم

میں عشق کی برکت سے دنیا اور اہل دنیا کے طور وطریق پر خوب ہنسا ہوں، اس لئے
خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ کسی دن میں بھی زمانہ کے ہاتھوں میں نہ پڑ جاؤں، اور دوسروں
کو مجھ پر ہنسنے کا موقع ملے،

وحشی خوشنما: ہزار سال پس از مرگ میتوانم زیست — اگر بروں نکشند از دلم خدنگ ترا

اگر میرے دل سے تیرے تیر کو کھینچ کر نہ نکال لیں تو میں اس کی لذت سے اور اس کے
سہارے مرنے کے بعد بھی ہزاروں سال زندہ رہ سکتا ہوں،

یک لحظہ گر بہ گریہ کنم کور می شوم — گویا چراغ چشم من از آب روشن است

اگر ایک لحظہ کے لئے بھی رونا بند کر دیتا ہوں، تو اندھا ہو جاتا ہوں گویا میری آنکھ کا چراغ
پانی سے روشن ہے، جس کی خاصیت آگ کو بجھانا ہے،

وحشی: نومیدیم رسید بجائے کہ گر کسے — آرد نوید وصل تو باور نمی کنم

میری ناامیدی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی وصل کی خوشخبری بھی لاتا ہے تو یقین نہیں آتا

وحشی یزدی: می نماید کہ سرِ عہد شکستن داری — خشم ایں بار تو چوں رنجش ہر بار تو نیست

اس مرتبہ تیری برہمی پہلے کی رنجشوں کی طرح نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو عہد شکنی پر آمادہ ہے
غالب کا شعر ہے،

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

چہ پیش آمد دلم را کو طپیدن باز بنشیند — چو مرغی کو بدام افتد ز پرواز بنشیند

میرے دل کو کیا واقعہ پیش آیا کہ اس نے تڑپنا چھوڑ دیا، اس مرغ کی طرح جو دام میں گرفتار
ہونے کے بعد اڑنے سے مجبور ہو جاتا ہے،

مرزا وحشی: داشتم دردے کہ تا اکنوں ز درماں فارغ است — ایں زماں محتاج درماں شد نمی پرسی چرا

میرا درد ایسا تھا کہ اب تک اسکو درماں سے عار تھا اور اب وہ درماں کا محتاج ہو گیا ہے، مگر
تو اس کا سبب نہیں پوچھتا، حالانکہ اس تغیر حال کا سبب پوچھنا چاہئے،

نگفتم ناشکیبم وعدہ را حدیست نشنیدی — بشوخی سر برآوردی و رسوا ساختی ما را

میں کہتا نہ تھا کہ میں بے صبر ہوں وعدے کی بھی ایک حد ہوتی ہے، مگر تو نے نہیں سنا
اور تیری شوخی اتنی بڑھ گئی کہ تو نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اور بے صبری نے مجھے رسوا کر دیا

ہلاک میشوی اکنوں و آں نمی گفتم — کہ شد کہ جام فریب است ناچشیدہ بہ است

دلی میں تجھ سے کہتا نہ تھا کہ محبت، فریب کا جام ہے اسکو نہ چکھنا ہی بہتر ہے، مگر تو نے
میرا کہنا نہیں مانا، اور اب اس کا نتیجہ ہلاکت سامنے آ رہا ہے،

بہ تمنائے تو ترک جہاں کردو لے — مہربانی تو ہم در خور اں می بایست

تیری تمنا میں ولی نے دونوں جہاں کو چھوڑ دیا ہے، اس لئے تیری مہربانی اسکے مطابق ہونی چاہئے

گر بمن قاصد اُو وعدۂ دیدار نداشت
چون نگاہے کہ بمن داشت باغیار نداشت

اگر محبوب کا قاصد اسکی طرف سے دیدار کا وعدہ نہیں لایا تھا، تو پھر کیوں مجھ پر اس کی جو نگاہ تھی دوسروں پر نہ تھی، یہ نگاہ توجہ وعدۂ دیدار کا ثبوت ہے،

چون بد و نیک منِ سوختہ خرمن پرسند
آہ گر آنچہ بدل کردہ ام از من پرسند

جب (قیامت کے دن) مجھ سوختہ ساماں کی نیکی و بدی کی پرسش کریں، تو کاش میرے دل میں جو تمنائیں ہیں ان کو بھی پوچھیں،

اسی سے ملتا جلتا ہوا غالب کا یہ تخیل ہے،

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

خرسند بہ امید جواب است دلم کاش
قاصد کہ رود جانب اُو دیر تر آید

میرا دل محبوب کے جواب کی امید میں بہت مسرور ہے، کاش جو قاصد جائے وہ دیر میں لوٹے کہ امید قائم رہے، ورنہ ممکن ہے جواب امید کے خلاف ہو،

بخواری کہ منم تا چہ لطف کرد بغیر
کہ میرسد بمن و شرمساری گذرد

میں جس ذلت و خواری میں مبتلا ہوں (اسکے مقابلہ میں) محبوب نے رقیب کے ساتھ کیا لطف و عنایت کی ہے کہ جب میرے سامنے آتا ہے تو شرمندہ گذر جاتا ہے،

بمصلحت گلۂ می کند ولی ز تیغ ستم
فدائے تست اگر صد ہزار جان دارد

ولی تیغ ستم کا گلہ مصلحۃً کرتا ہے ورنہ اگر اسکے سو ہزار جانیں ہوں تو تجھ پر سے نثار کر دے ایسی حالت میں شکایت کا کیا سوال ہے،

آرزو صد کار مشکل باز پیشِ دل نہاد
ورنہ بر من نا امیدی کار آسان کردہ بود

آرزو اور تمنا نے دل کے لئے سیکڑوں مشکلیں پیدا کر دی ہیں، ورنہ نا امیدی نے کام بہت آسان کر دیا تھا، کیونکہ کسی چیز سے مایوسی ساری مشکلیں ختم کر دیتی ہے، مشکلات تو امید پیدا کرتی ہے،

بود شِ تسلی تو غرض اے دلِ خموش
ایں وعدہ مقتضائے تقاضا نمی کند

اے دل خاموش ہو جا محبوب کے وعدے کا مقصد محض تسلی دینا تھا، اس قسم کے وعدے ایفا کیلئے نہیں کئے جاتے،

بگذشت زپیش من و غیرت بحکایت
پیچید کہ ہرگز نتواند بقفا دید

محبوب میرے سامنے سے گذر رہا تھا، مگر رقیب نے اسکو اسطرح باتوں میں لگایا کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتا تھا

بقدرِ طاقت خود ہر دلے غمے دارد
دل من است کہ اندوہ عالمے دارد

ہر دل اپنی طاقت کے مطابق غم میں مبتلا ہے، میرا دل ہے کہ سارے جہاں کا غم رکھتا ہے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میرے دل میں سارے جہاں کا غم کھانے کی طاقت ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی طاقت سے زیادہ بار اپنے اوپر ڈال لیا ہے،

ایں شامِ ہجر بود ولی چون بسر رسید
خاکت بسر کہ روز شد و زندہ ہنوز

ولی یہ ہجر کی شام تھی کس طرح بسر ہو گئی، تیرے سر پہ خاک ہجر کی صبح ہو گئی اور تو ابتک زندہ ہے تجھ کو تو مر جانا چاہئے تھا،

در سخن بود بغیرے چو براہش دیدم
شد خجل گفت کہ احوالِ تو می پرسیدم

میری نظر پڑی کہ محبوب سرِ راہ رقیب سے باتوں میں مشغول ہے تو (مجھے دیکھ کر) وہ شرمندہ ہو گیا کہنے لگا تمہارا ہی حال پوچھ رہا تھا،

ہر تو شنیدہ ام سخنہا
شاید کہ تو ہم شنیدہ باشی

میں نے تیرے لئے لوگوں چہ میگوئیاں سنی ہیں شاید تیرے کانوں تک بھی کچھ باتیں پہنچی ہوں،

مرا بہ نیم نگہ می تواں تسلی بود   دریغ از تو کہ ایں شیوہ را نمی دانی

مجھ کو نیم نگاہ یعنی ادنیٰ توجہ سے تسلی دی جا سکتی ہے، مگر افسوس تو یہ طریقہ ہی نہیں جانتا، اور تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا،

ملا وقف بخاری   یک صبحدم بصحن گلستاں گذشتۂ   شبنم ہنوز بر رخ گل آب می زند

تو ایک مرتبہ صبح کے وقت گلستاں کے صحن سے گذرا تھا، اور شبنم اب تک پھولوں کے رخ پر پانی کے چھینٹے مار رہی ہے، یعنی تجھے دیکھ کر پھولوں کو بیہوشی طاری ہو گئی یا تیرا چہرہ دیکھ کر پھول کمھلا گئے، ان کو ہوش میں لانے کے اور ان کو تر و تازہ کرنے کے لئے شبنم پانی چھڑک رہی ہے،

میر طاہر وحید   دیدم آں چشمۂ ہستی کہ جہانش نامند   آں قدر آب کزو دست تواں شست نداشت

میں نے اس سرچشمۂ وجود کو دیکھا ہے جسے دنیا کہتے ہیں، اس میں اتنا پانی بھی نہیں تھا کہ ہاتھ دھویا جا سکے، یعنی کہنے کو تو دنیا وجود کا سرچشمہ ہے، مگر وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ اس سے معمولی کام کی بھی نہیں نکل سکتا،

شوخی از رخ پردۂ شرم ترا وا می کند   لیک ہنگامیکہ عاشق را خبر از خویش نیست

تری شوخی تیرے رخ سے شرم کا پردہ ہٹاتی ہے، مگر اس وقت جب کہ عاشق کو اپنی خبر نہیں رہتی، اس لئے وہ لطف دیدار سے محروم رہتا ہے،

با یار کسے چہ گونہ سازد   چوں با دل خود نمی تواں ساخت

وہ عاشق محبوب کے ساتھ کیسے نباہ کر سکتا ہے، جب خود اپنے دل کے ساتھ نہیں نباہ سکتا، یعنی جب اپنے دل پر قابو نہیں تو دوسرے پر کیا اختیار ہے،

سراغ یار می گیرم، بہر کس میرسم اما   بخود از رشک میگویم کہ یا رب بیخبر باشد

میں ہر شخص کے پاس جا کر محبوب کے حال کی جستجو کرتا ہوں اور خود ہی رشک میں کہتا ہوں (کہ میں تو اس کا حال پوچھتا پھرتا ہوں) مگر وہ میری طرف سے یا میری جستجو سے بے خبر ہے،

گشتم خجل ز دامن جاناں و سعی خویش   تا چند شوق گیرد و ہمت رہا کند

میں محبوب کے دامن اور اپنی کوشش دونوں سے شرمندہ ہوں کہ کب تک شوق دامن پکڑتا رہے گا اور ہمت اس کو چھوڑتی رہے گی،

بباغ ہستی خود چوں شگوفۂ بادام   چو باز شد نظرم چشم از جہاں بستم

اپنی ہستی کے باغ یعنی دنیا میں آنکھ کے بعد بادام کی کلی کی طرح جیسے ہی آنکھ کھلی دنیا سے آنکھ بند کر لی، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ زندگی کا وقفہ اتنا مختصر ہے کہ آنکھ کھلتے ہی بند ہو گئی، یا دنیا کو دیکھ کر جب اسکی حقیقت ظاہر ہوئی تو اسکی طرف سے آنکھ بند کر لی

ز سرتا پا ہمہ حسنی نداری عیب از یں غیرے   کہ ہر عضو تو نگذارد کہ عضوے دیگرے بینم

تو سراپا حسن و خوبی ہے، صرف ایک عیب ہے، (تیرا ہر عضو حسن کے سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا ہے) کہ ایک عضو دوسرے عضو کو دیکھنے کی فرصت نہیں دیتا،

ز زخم تیغ نمیریم و لیک می ترسم   کہ زندہ مانم و گردی تو شرمسار از من

میں تیری تلوار کے زخم سے نہیں مر سکتا، لیکن خوف اس کا ہے کہ میں زخم کھانے کے بعد زندہ رہ جاؤں اور تجھ کو مجھ سے شرمندہ ہونا پڑے کہ قتل نہ کر سکا،

نظیری مشہدی   شراب خانۂ ما تا بحشر اگر کاوی   بجائے ریزۂ خم توبہ شکستہ بر آید

اگر حشر تک بھی تو میرے شراب خانہ کی زمین کھودتا رہے تو ٹوٹے ہوئے خم کے ٹکڑے کے بجائے ٹوٹی ہوئی توبہ برآمد ہو گی۔

شیخ علی نقی کمرہی:-

وائے بر جانِ خلائق اگر آرند بحشر — عوضِ روزِ قیامت شبِ تنہائی را

اگر حشر کے دن قیامت برپا کرنے کے بجائے شبِ تنہائی کو لے آئیں تو مخلوق کی جان پر بن جائے گی، کیونکہ ہجر کی شب تنہائی کو برداشت کرنا قیامت سے زیادہ سخت ہے،

امروز پرسشِ من کن بہ تکلف — کیں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد

تکلف ہی سے سہی آج میری حالت پوچھ لے کیونکہ یہ خستہ دل اگر بہت جیا تو شام تک مر جائے گا،

عاشقاں نامے بعجز و ناتوانی کردہ اند — کوہکن آخر بزور ایں قوم را بدنام کرد

عاشق اپنی ناتوانی اور درماندگی کیلئے مشہور تھے، مگر کوہکن نے (پہاڑ توڑ کر) زور و قوت میں ان کو بدنام کر دیا،

ہنگامِ وداعش میکنم نو عہد دیرینہ را — چو بیمارے کہ وقتِ مرگ تجدید ایماں می کند

میں محبوب کو رخصت کرتے وقت پرانے عہد کو پھر تازہ کرتا ہوں جس طرح بیمار مرتے وقت ایمان کی تجدید کرتا ہے،

علاجِ سرکشی او تغافل ست دریغ — کہ در طبیعتِ عشق ایں دوا ضرر دارد

محبوب کی سرکشی کا علاج یہ ہے کہ اس کو بھلا دیا جائے، مگر افسوس کہ عشق کے مزاج کے لئے یہ دوا مضر ہے کہ تغافل شانِ عشق کے خلاف ہے،

مولانا نازکی: نے گلاب است اینکہ بر رخسارہ خوش می زنی — تا نسوزد عالمے آبے بہ آتش می زنی

محبوب کے رخساروں پر جو عرق گلاب چھڑک رہا ہے، وہ عرق گلاب نہیں بلکہ آگ پر پانی چھڑک رہا ہے کہ اس کی تپش سے دنیا نہ جل جائے،

دریں مدت غمِ ہجراں عبث بر خود پسندیدم — ندانستم کہ از مرگم دلت خوشنود می گردد

میں اتنے دنوں تک غمِ ہجر بیکار برداشت کرتا رہا مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری موت سے تیرا دل خوش ہوگا ورنہ جان دیدیتا

بہ بدی در ہمہ جا نام بر آرم کہ مباد — خونِ من ریزی و گویند سزاوار نبود

میں بدی میں ہر جگہ اپنا نام اس لئے مشہور کر رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ تو میرا خون کرے اور لوگ یہ کہیں کہ یہ ناروا بات کی اور جب بدنام ہو جاؤں گا، تو لوگ تجھکو مجرم بنانے کے بجائے سمجھیں گے کہ میں اسی سزا کا مستحق تھا،

مشو از حالِ من غافل کہ زخمِ کاری دارم — مبادا دیگرے صیدِ ترا از خاک برگیرد

میرا زخم بڑا کاری ہے اس لئے میری طرف سے غفلت نہ برت ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا شخص تیرے شکار کو زمین سے اٹھا لے زخمی شکار بھاگ نہیں سکتا...... اگر شکاری اس کو چھوڑ دیتا ہے تو کوئی دوسرا شخص اس پر قبضہ کر لیتا ہے،

شد عمر و سرگرانی او بر طرف نہ شد — بر من بقدرِ مرتبہ عشق ناز کرد

محبوب کی کشیدگی پہ لطیف توجیہ کرتا ہے کہ پوری عمر گذر گئی مگر اس کی سرگرانی دور نہ ہوئی کیونکہ اسکا ناز میرے عشق کے مطابق ہے، میرے عشق کا مرتبہ بلند ہے، اسلئے اس کا ناز بھی مجھ سے زیادہ ہے،

آنکہ شامِ زندگانی شمعِ بالینم نہ شد — کے پس از مرگم چراغ بر سرِ گور آورد

جو میری شامِ زندگی میں شمعِ بالیں نہ بنا یعنی میرے مرتے وقت نہ آیا وہ میرے مرنے کے بعد میری قبر پر چراغ کیا جلائیگا،

دولت ایں بود کہ مردیم بہنگامِ وداع — آں قدر زندہ نماندیم کہ محمل برود

بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ محبوب کو رخصت کرتے وقت ہی مر گیا اور محمل کی روانگی کے وقت تک

زندہ نہیں رہا اور نہ اس کا نظارہ موت سے بھی زیادہ سخت تھا،

گر زیر گلبنے قفسم را نمی نہی   جائے بنہ کہ نالہ بگوشِ چمن رسد

اگر تو کسی پھول کے پودے کے نیچے میرا قفس نہیں رکھتا تو کم سے کم ایسی جگہ رکھدے کہ جہاں سے میرا نالہ چمن کے کانوں تک پہنچ سکے،

نظیری را بمحفل بردم امروز و غلط کردم   مرا رسوائے عالم ساخت چشمِ گریہ آلودش

میں نے آج نظیری کو (محبوب کی) محفل میں لیجاکر غلطی کی اسکی گریہ آلود آنکھوں نے مجھے ساری دنیا میں رسوا کر دیا

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید   گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

اس سست وفا سے میرے محبوب کی بو آتی ہے، پھول کو میرے ہاتھ سے لینا کہ میں بیخود اور از کار رفتہ ہوا جاتا ہوں، ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں،

بے رخ تو... پروانۂ امشب بچراغم   خود را بجہاں بیخودی سوخت کہ داغم

آج رات جب تیرا رخ انور سامنے نہیں تھا پروانہ میرے چراغ پر اس بیخودی سے جل گیا کہ میرے دل پر داغ پڑ گیا یعنی پروانہ کی جانسوزی کو دیکھکر میرے دل میں اسلئے داغ پڑ گیا کہ اگر تمہارا رخ روشن موجود ہوتا تو میں اس پروانہ کو رشک سے جلتا ہوا پاتا کہ اگر تو ہوتا تو پروانہ چراغ پر جان دینے کے بجائے تجھ پر جان دیتا،

گر در خدمت عمریست می ندانم چہ شد قدرم   برہمن می شدم گر ایں قدر زنار می بستم

میں تیری خدمت میں ایک مدت سے اسیر ہوں، مگر تیری نگاہوں میں اسکی کوئی قدر نہیں اگر اتنے دنوں تک زنار باندھتا تو برہمن کا درجہ حاصل کر لیتا،

چہ خوش است از دو یکدل سرِ حرف باز کردن   سخن گزشتہ گفتن گلہ دراز کردن

دو ہم مذاق (یکجا بیٹھے) دوستوں کا آپس میں مل کر باتیں چھیڑنا پرانی باتوں کو یاد اور آپس میں گلے شکوے کرنا، کس قدر خوشگوار ہوتا ہے،

چند قدیم نایاب سکّے

از جناب انور احمد صاحب سوپاری

سوپارہ کے تاریخی پس منظر کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون (معارف اگست ۱۹۶۳ء تا نومبر ۶۳ء) اس مضمون کے بعد راقم کو سوپارہ سے ساتواہن خانوادہ کے چند نایاب سکے دستیاب ہوئے اُن سکوں کو سمجھنے میں بڑی دقت کا سامنا تھا تاہم میرے دوست ڈاکٹر پرمیشوری لال گپتا (پٹنہ میوزیم) کی اعانت سے ان سکوں پر ایک مقالہ تیار ہو گیا جسے راقم نے ۵۵ ویں Numismatic Conference منعقدہ ناگپور ۱۹۶۷ء میں پڑھا تھا۔

۱۸۸۲ء کی کھدائی کے بعد سوپارہ سے متعلق آرکیولوجی کے اعتبار سے بہت کم معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس کھدائی کے دوران میں استوپ سے خانوادۂ ساتواہن کا ایک سکہ دستیاب ہوا تھا اسکے بعد کسی کو اس خاندان کے کسی سکہ کا پتہ نہیں چلا، راقم کو مختلف حکمران خاندانوں کے تقریباً دو سو سکے ملے ہیں، جن میں چند سکے نایاب ہیں، اور اس ساخت کے سکے اب تک دستیاب نہیں ہوئے تھے، یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ سب سکے کُمیٹی (Kumeti) نامی جگہ سے ملے ہیں، کمیٹی قاضی قطب الدین کمال الدین کی ملکیت تھی، یہ کل تین سکے ہیں، جن پر براہمی رسم الخط میں عبارت کندہ ہے، بہت سے سکے فرسودہ حالت میں ہیں ان میں جن نایاب سکوں کو کسی حد تک پڑھ سکا ہوں اُن کا ذکر حسب ذیل ہے،

(۱) دھات: سیسہ - گول - وزن: ۲ گرام

سیدھے رخ پر سہ محرابی ٹیلے، ان پر ہلال، ان کے نیچے ایک سیدھا خط کنارے پر یہ عبارت ہے "ریثو...... و......... وی س" پوری عبارت یوں ہو سکتی ہے

"ریثو، واسی تھ پوتاس، پولو اوس"

پشت پر:- اجینی نشان

اس ساخت کے سکوں کا عکس ڈاکٹر وی. وی. میراشی شائع کر چکے ہیں، انھیں یہ سکے دکن سے دستیاب ہوئے تھے، مگر ان سکوں کی عبارت صاف نہیں تھی، زیر بحث سکوں کی دریافت سے ساتواہن خانوادہ کے جاری کردہ مختلف سکوں میں اضافہ ہوا ہے، اس سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے، کہ واسٹھی پتر پولو ماوی (Vaasithi Putra Pulumaasi-) اس خاندان کا حکمراں تھا، جس نے اس ساخت کے سکے جاری کئے تھے،

(۲) سیسہ۔ گول۔ وزن ۲/۱۰ گرام،

سیدھے رخ پر، سہ محرابی ٹیلے، نیچے ایک لہراتا خط

عبارت:-

"س ۔ ۔ ب ۔ ۔ م .... س ...... ن اس"

پشت پر: کوئی عبارت نہیں،

سکہ کی عبارت نا مکمل ہے، جس حد تک پڑھی جا سکتی ہے، اسے ہم سمس پڑھ سکتے ہیں جو "سوامی" کے ہم معنی ہے، اور آخری دو حروف "ن س" سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے یہ سکے جاری کئے تھے، اس کا نام سانگرنی تھا، سوامی کا لفظ ساتواہن کے سکوں پر اگرچہ پایا نہیں، لیکن اس ساخت کے سکوں کے لئے بالکل نادر ہے، جو مزید تحقیق کا طالب ہے،

(۳) تین سکے۔ سیسہ۔ گول۔ وزن (۱) ۲ گرام (۲) ۲ گرام (۳) ۲/۲۱ گرام

سیدھے رخ پر: سہ محرابی ٹیلے، اوپر ہلال، نیچے سیدھا خط، دائیں طرف ایک نشان جو دوشاخہ آنکس کے مماثل ہے،

پشت پر: اجینی نشان کے ساتھ صرف ایک دائرہ ہے

یہ سکے اس لئے قابل توجہ اور نئے ہیں کہ ان کے بائیں طرف دوشاخہ آنکس کا نشان کندہ ہے، اگر ان سکوں کو ساتواہن خاندان سے منسوب کیا جائے تو یہ بات قابل غور ہے کہ ساتواہن کے جتنے بھی سکے ابتک دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ نشان نہیں ہے، اور پھر یہ کہ یہ سکے سوپارہ میں ملے ہیں، جو ان کے دور حکومت میں ایک اہلہ (ضلع) اور ان کے مرکز سے بہت دور تھا، حالانکہ آندھرا پردیش سے جو قریب ہے، اس ساخت کے سکے ابھی تک نہیں ملے ہیں،

ان تینوں سکوں کی عبارت واضح نہیں ہے، البتہ نچلے حصہ کی عبارت صاف ہے، اس کے باوجود مفہوم اچھی طرح واضح نہیں ہوتا، ایک سکہ پر چند حروف کے مٹے مٹے نشان نظر آتے ہیں، بقیہ دو سکوں کی عبارت کے حروف کسی حد تک پڑھے جا سکتے ہیں،

یہ کل گیارہ حروف ہیں، ان دو سکوں میں سے ایک سکہ پر "ریثوں، س، و" صاف نظر آتے ہیں، ان کے بعد ایک اور غیر واضح حرف ہے، دوسرے سکہ پر ریثون، س، و، شکستہ حالت میں ہیں، دوسرے سکے پر مندرجہ بالا تمام حروف شکستہ اور دھندلے ہیں، ان کے بعد دو حروف ر، ب صاف ہیں اور ایک حرف "ل" سے مشابہ ہے، اس کے بعد م. اور ر ہے، ان حروف کی ترتیب یوں ہو سکتی ہے،

"(ر) ریثون، س، و، ر، ب، (ل) م، ر" ان حروف سے کوئی واضح عبارت نہیں بنتی، جس سے اس بادشاہ کا نام ظاہر ہو سکے، جس نے یہ سکے جاری کئے،

تھے، لیکن اتنا یقینی ہے، کہ جس حکمراں نے اس ساخت کے سکے جاری کئے تھے وہ یا تو خانوادۂ ساتواہن سے تعلق نہیں رکھتا تھا، اور اگر تعلق رکھتا تھا، تو تاریخ میں اب تک گمنام ہے، یا ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ساتواہن سے قبل یا بعد میں اس علاقہ پر قابض تھا، اس لئے جب تک اس مخصوص ساخت کا کوئی صاف سکہ دستیاب نہیں ہوتا یہ امر مشکل ہے،

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ کے پہلے اڈیشن میں مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور تمام تیموری شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعرا اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات کی تفصیل بیان کی گئی تھی، جس کو ارباب ذوق و تحقیق نے بیحد پسند کیا، اور اس کے حوالے اپنے مقالات اور تصنیفات میں دیئے، اب اسی کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے کہ تمام مغل سلاطین اور انکے عہد کی ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں مغل سلاطین میں سے پہلے تین شہنشاہوں یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور انکے عہد کے امراء شعراء اور ارباب فضل و کمال کے تذکرے کے ساتھ انکے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسری جلد میں بقیہ مغل سلاطین اور انکے دربار کے علماء، فضلاء و شعراء کا تذکرہ ہوگا، اسمیں اتنے اضافے ہوئے ہیں کہ بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، پہلے سے کہیں جامع اور مکمل، قیمت ۱۲ روپے

"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

اندھیرا شام ہی سے جسکی کرنوں کو نگل جائے
خدا کی شان ہو وہ سنتِ یونس کو دہرائے

وہ کیا اپنی نظر مردِ عصرِ نو سے ٹکرائے
تجلی ہو کے جو بھڑکے ہوئے شعلوں سے ڈر جائے

مرا ذوقِ تماشا ہر نفس مجروح ہوتا ہے
کوئی دیوانہ اٹھے پرچمِ تہذیب لہرائے

تبا لے خستہ دل اس وقت تیرا حال کیا ہوگا
یہاں جو کہہ رہا ہے حشر تک وہ سامنے آئے

تغیر آفریں لمحو! یہ چھیڑ اچھی نہیں ہم سے
ہمیں وہ سوزِ دل رکھتے تھے جو تجھ کو پگھلائے

انھیں پھر کون اس دنیا میں سینے سے لگائے گا
اگر انسان ہی اخلاق کی قدروں کو ٹھکرائے

مری کشتی کو ٹکراتا ہے امواجِ حوادث سے
یہ کیوں چاہوں کہ ساحل کھنچ کے میرے پاس آجائے

جسے سب جانتے ہیں اولِ افتادِ آدم سے
قیامت ہے بنی آدم کو وہ شیطان بہکائے

خدا اس دل کو زندہ رکھے اسکا ذوقِ جدت بھی
جو پھولوں کو شگفتہ دیکھ کر سجدے میں گر جائے

ہمیں نے پھوڑ دی ہو لیس للانسان کی پابندی
جو ہم چاہیں تو دورِ عشرتِ رفتہ پلٹ آئے

عروج! اعجازِ اسلوبِ بیاں کی انتہا یہ ہو
کہانی کہنے والا خود کہانی بن کے رہ جائے

غزل

از جناب ولی الحق صاحب انصاری لکھنؤ

وہی طبیعت کی ہے اداسی وہی ہے دل کی فغاں مزاجی
بہار کیا زندگی میں آئے نہ جا سکے جب خزاں مزاجی

نبھے گی کیونکر بنے گی کیسی تمھیں بتاؤ یہ مہ جبینو،
ادھر تمھاری وہ جلوہ پاشی ادھر ہماری کتاں مزاجی

ہیں فلک کی بلندیوں تک اڑائے پھر رہے تھے بازو
زمیں پہ لیکن اتار لائی ہماری یہ آشیاں مزاجی

یہی ہے فطرت یہی طبیعت یہی اصولِ حیات اپنے
بہ پیش گرگاں درندہ خوئی بہ روی میشاں شباں مزاجی

بلندیوں تک اگر رسائی کی ہے تمنا تو مثلِ شاہیں
خمیر میں پہلے اپنے شامل تو کر لے تو آسماں مزاجی

مصیبتوں کا اگر اندھیرا ہوا تو چمکیں گے اور جوہر
ملی ہے میرے وجود کے ذرے ذرے کو کہکشاں مزاجی

نہ جانے کیا کچھ کرے گی ظالم یہ تیری شوخی یہ تیری تیزی
نہ جانے ڈھائے گی کیا قیامت یہ تیغ طبعی سناں مزاجی

ولی نہ جانے نکل بھی پاؤ گے تم مصالح کے بندھنوں سے
نہ جانے بدلے گی بھی کبھی یہ تمھاری سود و زیاں مزاجی

معیارِ طلب

از جناب وارث القادری

کیا ہے اس دنیا میں کس منہ سے یہ دنیا مانگتا — مانگتا اُن سے تو میں اُنکے سوا کیا مانگتا
در بدر اے کاش دنیا میں نہ پھرتا مانگتا — بات بن جاتی جو مالک ہی سے بندہ مانگتا
خود چمک سکتا تو کیوں پرتو تمھارا مانگتا — بھیک اجالے کی نہ سورج روزمرہ مانگتا
سارا عالم دولتِ دیدار کا طالب اُدھر — اور ادھر یہ آرزو میری کہ تنہا مانگتا
ہم نہ کہتے تھے کہ جھولی خالی ہی رہ جائیگی — بندگی کے دائرے میں کاش بندہ مانگتا!
درد آہیں یاد آنسو غم خلش بے انتہاں — اس نے بے مانگے ہی سب کچھ دیدیا کیا مانگتا
چاند آیا ان کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے — اور سورج عاجزی کے ساتھ نکلا مانگتا
جی! وفا کے قدرداں بھی آپ ہیں بندہ نواز — آپ سے انعام میں اپنی وفا کا مانگتا؟
گلشن ہستی کے رکھوالے! یہ کیا ممکن نہ تھا — اک ذرا کھلنے کی مہلت دل کا غنچہ مانگتا
چشم ساقی بے نیاز جام و صہبا کر گئی — توبہ توبہ میں بھلا کیوں جام صہبا مانگتا
اس کی عظمت سے اگر آگاہ ہوتا باغباں — وہ بھی میرے آشیاں کا کوئی تنکا مانگتا

سب یہ کہتے ہیں خوشی میں ہم کو حصہ چاہئے
کاش وارث رنج و غم میں کوئی حصہ مانگتا

مطبوعات جدیدہ

اللآلی المنثورہ۔ مرتبہ مولانا عبد الحفیظ بلیاوی مرحوم تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۹ قیمت صہ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۶

یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد پر ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جن کو ان کے ایک لائق شاگرد اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاذ ادب مولانا عبد الحفیظ بلیاوی مرحوم نے دوران درس قلمبند کیا تھا، اس میں ان دونوں کتابوں کے بعض ابواب اور ان کے اسناد و متون کے مشکلات سے تعرض کیا گیا ہے، اور ان میں بیان کئے گئے فقہی آثار، ائمہ کے مسالک، حنفی مذہب کے وجوہ ترجیح اور متعارض حدیثوں میں تطبیق وغیرہ کی خاص طور پر وضاحت اور مختلف وجوہ و معانی پر دلالت کرنے والی حدیثوں اور روایت سے متعلق ضروری اور اہم مسائل و مباحث کی تشریح کی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ مجموعہ طلبۂ حدیث کے لئے واقعی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، لیکن اگر اس کو ترتیب و تبویب کے بعد کسی صاحب فن کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع کیا گیا ہوتا تو اس سے مراجعت میں بھی آسانی ہوتی اور اس کا افادہ بھی زیادہ ہو جاتا، موجودہ شکل میں یہ نوٹ اور اشارات درس و تدریس کا مشغلہ رکھنے والوں ہی کے لئے مفید اور کار آمد ہو سکتے ہیں،

اخبار التنزیل، مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۹۸، قیمت غیر مجلد صہ مجلد سے مرتبہ مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد، دہلی نمبر ۶،

قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا ایک ثبوت امور غیب کے متعلق اسکی خبریں اور پیشین گوئیاں بھی ہیں جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں قرآن مجید کی پینسٹھ اور حدیث کی پینتیس خبریں اور پیشینگوئیاں نقل کر کے ان کی تاویل و تشریح کی ہے اور آیندہ ہونے والے واقعات و حوادث سے ان کی تطبیق و تصدیق دکھائی ہے، شروع میں قرآن مجید کے اعجاز کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، گو مصنف کی بعض توجیہات سے اتفاق ضروری نہیں ہے، تاہم ان کی یہ محنت اور اس پہلو سے قرآن و حدیث کی خدمت قابل تحسین ہے،

امراض صدر، مرتبہ جناب مولوی حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۸۰، قیمت درج نہیں، ناشر وصیۃ المعارف دیوبند یوپی،

زیر نظر کتاب میں سینہ اور قلب کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کے اسباب اور علامتیں تحریر کی گئی ہیں، یہ در اصل ایک امریکن کتاب کی تلخیص ہے، جس میں جسم کی تمام بیماریوں کے اسباب اور علامتوں کی نشاندہی کی گئی تھی، لائق مصنف نے اس کے اسی حصہ کی ترجمہ و تکمیل کی ہے، جس میں امراض صدر و قلب کا ذکر ہے، اس سے انگریزی سے ناواقف معالجین اور اطبار کو ان امراض کی تشخیص میں آسانی ہوگی، اس میں اتنی سے زیادہ امراض قلب و صدر کے اسباب بیان کئے گئے ہیں، اور آخر میں بعض کے مجرب نسخے بھی لکھ دیئے گئے ہیں، یہ خالص فنی کتاب عام مذاق کی نہیں ہے، مگر اہل فن کے لئے نہایت کار آمد اور مفید ہے، اس سے اردو کی طبی کتابوں میں مفید اضافہ ہوا،

دنیا اسلام سے پہلے، اور اس کے بعد مرتبہ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۲۸ مجلد قیمت ۵؎ پیسے، پتہ:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی نمبر ۲۵

اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا، اور اسلام کے بعد اس میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی یہ فاضل مصنف کے چار مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی دنیا کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، اور اس زمانہ کے متمدن ممالک اور مشہور مذاہب روم، ایران، چین و ہندوستان اور یہودیت و عیسائیت کے سیاسی، معاشی سماجی اور مذہبی و اخلاقی حالات بیان کئے گئے ہیں، دوسرے مضمون میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لائحہ عمل اور پروگرام کا ذکر ہے، جو آپ نے دنیا کے حالات کی اصلاح اور انسانیت کے بگاڑ کی درستی کے لئے پیش کیا تھا، تیسرے مضمون میں اسلام کی اہم اور بنیادی تعلیم / خدا کی وحدانیت کا ذکر ہے، اور آخری مضمون میں سیرت پاک کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، یہ مضامین مختصر ہونے کے باوجود نہایت مفید ہیں، انداز تحریر موثر اور دلکش ہے،

اختلاف الائمہ، از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۷۶ قیمت ۵۰ پیسے پتہ: کتب خانہ اشاعت اسلام محلہ مفتی سہارنپور۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ نے رسالہ المظاہر کے لئے سنہ ۱۳۴۶ھ میں یہ مقالہ بالاقساط لکھنا شروع کیا تھا، مگر رسالہ کے بند ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا اور قدردانوں کے اصرار اور حضرت شیخ کی خواہش کے باوجود ان کی علمی تدریسی اور تصنیفی مشغولیتوں کی وجہ سے اس کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا، اس لئے ان کے عزیز مولوی محمد شاہد صاحب نے افادۂ عام کے لئے اسی ناتمام مضمون کو اب کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعض رسائل و تصنیفات کی طرح امت کے اختلافات کے اسباب و وجوہ بیان کئے گئے ہیں، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں اختلاف روایات یعنی رسول اکرم صلعم

کے اقوال و اعمال کے تعارض کی توجیہات تحریر کی گئی ہیں، دوسرے میں اختلاف آثار یعنی صحابہ کرام و تابعین عظام کے اقوال و افعال میں تعارض کے وجوہ کا ذکر ہے، اور آخر میں اختلاف مذاہب یعنی فقہاء و مجتہدین کے درمیان اختلاف کے اسباب بیان کر کے دکھایا گیا ہے کہ فروع و جزئیات میں اختلاف ناگزیر اور فطری ہے، اور اس بارہ میں جو اشکالات و شبہات پیش کئے جاتے ہیں وہ عمل اور احکام شرعیہ میں قصور نظر کا نتیجہ ہیں گو رسالہ ناتمام ہے تاہم اس میں کوئی نقص اور کمی معلوم نہیں ہوتی، اور جس قدر بھی ہے نہایت مفید ہے، حضرت شیخ الحدیث کے دوسرے علمی افادات و تبرکات کی طرح یہ رسالہ بھی مفید حدیثی و فقہی مباحث پر مشتمل ہے اس لئے یہ فقہ و حدیث کے طلبہ کے خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہے،

مکاتیب طیب۔ مرتبہ جناب مولوی شفیق احمد اعظمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۲۴ مجلد قیمت للعہ پتہ:۔ مکتبہ نعمانیہ دیوبند، یوپی،

یہ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ان خطوط و مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہند و پاک کے بعض اصحاب کے استفسارات کے جواب میں، گذشتہ دس سال کے اندر وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اس لئے ان میں مختلف النوع علمی و دینی اور فقہی و کلامی مسائل کا ذکر ہے، بعض میں شرعی احکام کے حکم و مصالح بیان کئے گئے ہیں، بعض خطوط میں اسلام اور اسلامی تعلیم کے بارہ میں شکوک و شبہات اور بعض عصری مسائل تسخیر قمر وغیرہ سے متعلق سوالات کا جواب دیا گیا ہے، چند خطوط میں جماعت دیوبند کے افکار و عقائد تحریر کئے گئے ہیں، اور آخر میں مولانا کا ایک طویل مکتوب درج ہے، جو انھوں نے لندن سے اپنے خویش مولانا حامد الانصاری غازی کو لکھا تھا، اس میں وہاں کے دلچسپ حالات و کوائف کا ذکر ہے، فاضل مرتب نے ہر مکتوب سے پہلے اصل استفسار کا خلاصہ بھی دیدیا ہے، جس سے جواب کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے، یہ خطوط دلچسپ اور مفید علمی و دینی معلومات پر مشتمل ہیں شروع میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب برہان کے قلم سے دلچسپ مقدمہ بھی ہے،

درخشاں:- از جناب حفیظ بنارسی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش قیمت صہ، پتہ کلچرل اکاڈمی رینا ہاؤس جگ جیون روڈ. گیا،

جناب حفیظ بنارسی نوجوان اور خوش فکر شاعر ہیں انکا کلام ادبی رسائل میں چھپتا رہتا ہے، اب انھوں نے "درخشاں" کے نام سے اپنا پہلا مجموعہ کلام شائع کیا ہے، جو غزلوں کے علاوہ چند نظموں اور قطعات و رُباعیات پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کی رنگینیاں بھی ہیں، اور حالات حاضرہ کے مرقعے بھی "عہد نو" کی اخلاقی پستی اور سماجی ناہمواری کے بارہ میں کہتے ہیں؛ ؎

ابھی نامکمل ہے جشن چراغاں کہیں روشنی ہے کہیں ہے سیاہی

حفیظ صاحب کی نظموں اور رباعیات و قطعات میں فکر و خیال کی بلندی کے ساتھ انداز بیان کی دلکشی بھی ہے، "تاج محل" میں ایک مشہور ترقی پسند شاعر کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، "جوانی" اور "شاہد بازار" وغیرہ نظموں سے ان کے تخیل کی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے "درخشاں" ادبی حلقوں کے خیر مقدم کے لائق ہے،

ہدیہ عثمانی:- از [illegible] انا عثمان احمد قاسمی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۲۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۶، پتہ علمی کتاب گھر. شاہ گنج، جون پور،

مولانا عثمان احمد قاسمی مدرس مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج موزوں طبع اور خوش فکر شاعر بھی ہیں نعت گوئی سے ان کو زیادہ مناسبت ہے، اور وہ توحید و رسالت کے مرتبہ شناس اور الوہیت و نبوت کے حدود [illegible] سے واقف ہیں، اسلئے ان کی نعتیں جوش و جذبہ کے ساتھ خیالات کے اعتدال و توازن کا نمونہ ہیں، مجموعہ کے آخر میں چند نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، نظموں میں بعض مرحومین کا نوحہ اور موجود اکابر علم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے،

"ض"

جلد ۱۱۲ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۳ء عدد ۴

مضامین